ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

تیسیر القرآن کا مطالعہ
سید جلال الدین عمری (دہلی)

اندلس میں فقہی مذاہب کا ارتقاء
جناب محمد احمد زبیری (اسلام آباد)

ماپلا مسلمانوں میں تعلیمی تحریک کا ارتقاء
ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی (علی گڑھ)

صفاتِ الٰہی کے بیان کا قرآنی اسلوب
ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس (لاہور)

اسلام اور تہذیب جنس (۲)
مولانا سلطان احمد اصلاحی

شریف لاہیجی - حیات وخدمات
پروفیسر کبیر احمد جائسی (علی گڑھ)

تعارف وتبصرہ
ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی (علی گڑھ)

اِدارہ تحقیق وتصنیفِ اسلامی

پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ-۲۰۲۰۰۱

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

اپریل ——— جون ۲۰۰۶ء

مدیر

سیّد جلال الدّین عمری

معاون مدیر

محمد رضی الاسلام ندوی

پانے والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ-۲۰۲۰۰۱

پوسٹ بکس ۹۳

سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی علی گڑھ

جلد ۲۵ شمارہ: ۲

ربیع الاول ـــــــــ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ

اپریل ـــــــــ جون ۲۰۰۶ء

زرِ تعاون

اندرونِ ملک

فی شمارہ	۲۵ روپے
سالانہ	۱۰۰ روپے
سالانہ (لائبریریاں وادارے)	۱۲۵ روپے

بیرونِ ملک

سالانہ (انفرادی)	۴۰۰ روپے
سالانہ (ادارے)	۶۰۰ روپے

پاکستان

سالانہ (انفرادی)	۲۰۰ روپے
سالانہ (ادارے)	۳۰۰ روپے

طابع وناشر سید جلال الدین عمری نے بھارت آفسیٹ دہلی-۶ سے چھپوا کر ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ سے شائع کیا

فہرست مضامین

حرف آغاز

تیسیر القرآن کا مطالعہ — سید جلال الدین عمری — ۵

تحقیق وتنقید

اندلس میں فقہی مذاہب کا تعارف اور ارتقاء — جناب محمد احمد زبیری — ۳۷

ماپلا مسلمانوں میں تعلیمی تحریک کا ارتقاء — ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی — ۴۸

بحث ونظر

صفاتِ الٰہی کے بیان کا قرآنی اسلوب اور انسانی زندگی پر ان کے اثرات — ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس — ۶۱

اسلام اور تہذیبِ جنس (۲) — مولانا سلطان احمد اصلاحی — ۸۵

سیر وسوانح

شریف لاہیجی - حیات و خدمات — پروفیسر کبیر احمد جائسی — ۱۰۳

تعارف وتبصرہ

مکی اسوۂ نبوی - مسلم اقلیتوں کے مسائل کا حل — ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی — ۱۱۳

تازیانے — ،، — ۱۱۴

اردو رسائل کے قرآنی مضامین کا اشاریہ — ،، — ۱۱۵

حركة الترجمة في العصر العباسي — ،، — ۱۱۷

خبر نامہ ادارۂ تحقیق و تصنیفِ اسلامی — ادارہ — ۱۱۹

اس شمارے کے لکھنے والے

جناب محمد احمد زبیری ——————

نائب مدیر ماہ نامہ دعوۃ، دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی ——————

مدینہ منزل نیو سرسید نگر علی گڑھ (سابق صدر شعبۂ عربی، کالی کٹ یونیورسٹی)

ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس ——————

شعبۂ اسلامیات، جی سی یونیورسٹی، لاہور

مولانا سلطان احمد اصلاحی ——————

رکن ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ

پروفیسر کبیر احمد جائسی ——————

ساجدہ منزل، اقرا کالونی، علی گڑھ (سابق ڈائرکٹر ادارۂ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی ——————

رکن ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ

سید جلال الدین عمری ——————

صدر ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

تیسیر القرآن کا مطالعہ

——— سید جلال الدین عمری

جماعت اسلامی ہند کا قیام ۱۶-۱۸/اپریل ۱۹۴۸ء کو الٰہ آباد میں عمل میں آیا۔ اس نے اپنے قیام کے بعد ہی سے اس ملک میں دعوت وتبلیغ کی اہمیت شدت سے محسوس کی اور اس کے لیے عملی اقدامات بھی شروع کر دیے۔ اسلام کی دعوت کا ایک موثر ذریعہ یہ ہے کہ قرآن مجید کو مخاطب کے سامنے پیش کیا جائے اور اس پر غور وفکر کی اسے دعوت دی جائے۔ قرآن مجید اسلام کی اساس ہے۔ اس کے مطالعہ سے وہ اسلام کے موقف کو بہتر طریقہ سے سمجھ سکتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ قرآن مجید کا صحیح معنیٰ ومفہوم پوری وضاحت کے ساتھ اس کے سامنے آئے۔ اسلام کے بارے میں جو شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں یا اس کی تعلیمات پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان کا قرآن مجید ہی کی روشنی میں جواب دیا جائے۔ جماعت نے طے کیا کہ یہ کام پہلے اردو زبان میں ہو اور پھر اسے ملک کی سرکاری زبان ہندی اور دوسری علاقائی زبانوں میں منتقل کیا جائے۔ اس مشکل اور نازک کام کے لیے جماعت نے اپنے افراد میں سے سب سے بہتر شخص نام ور عالم دین استاذ محترم مولانا صدرالدین اصلاحیؒ کا انتخاب کیا اور صحیح انتخاب کیا۔ وہ اس کے سب سے زیادہ اہل تھے۔

مولانا صدرالدین اصلاحیؒ (۱۹۱۷ء-۱۹۹۸ء) اس سے پہلے 'اساس دین کی تعمیر' 'فریضۂ اقامتِ دین' اور 'معرکۂ اسلام و جاہلیت' جیسی وقیع کتابوں کے مصنف کی حیثیت سے معروف تھے۔ ان کے مقالات علمی جرائد ورسائل میں شائع ہو رہے تھے۔ ان

تصانیف اور مقالات میں انھوں نے قرآن مجید کو جس طرح اپنی تحقیقات کی بنیاد بنایا تھا اس سے قرآن مجید پر ان کی وسیع اور گہری نظر کا ثبوت مل رہا تھا اور وہ علمی حلقوں میں قرآن کے ایک معتبر عالم کی حیثیت سے متعارف تھے۔

تیسیر القرآن کا آغاز اور اختتام

مولانا صدر الدین اصلاحیؒ نے پروگرام کے مطابق 'تیسیر القرآن' کے نام سے تفسیر لکھنی شروع کی اور یہ بالاقساط جماعت اسلامی کے ترجمان ماہ نامہ 'زندگی' رام پور میں شائع ہوتی رہی۔ اس کی پہلی قسط اگست، ستمبر ۱۹۵۰ء کے مشترکہ شمارہ میں اور آخری قسط اگست، ستمبر ۱۹۵۳ء کے مشترکہ شمارہ میں چھپی۔ ان قسطوں میں سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی تفسیر مکمل ہوئی۔

ایک نئی تفسیر کی ضرورت

مولانا نے 'تیسیر القرآن' کے شروع میں مختصر سا مقدمہ لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے اس امر کا تذکرہ کیا ہے کہ ایک نئی تفسیر کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ ان کے نزدیک موجودہ تراجم و تفاسیر اپنی تمام تر قدر و قیمت کے باوجود مسلمانوں کے ذہن اور ان کی ضروریات کے پیش نظر لکھی گئی ہیں، ان میں غیر مسلم ذہن کو سامنے نہیں رکھا گیا ہے۔ وہ اپنی اس تفسیر کے ذریعہ اس کمی کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔

اس سے یہ بات واضح ہے کہ مولانا کے پیش نظر پورے قرآن مجید کی تفسیر تھی۔ کسی ایک جزء کی تفسیر سے وہ ضرورت جو مولانا نے بیان کی ہے، کسی حد تک ہی پوری کی جاسکتی ہے، صحیح معنیٰ میں اس کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ انھوں نے موجودہ تفسیر کی کئی ایک آیات کے ذیل میں لکھا ہے کہ اس کی تفصیل آئندہ فلاں سورت میں آئے گی۔ یہاں اس کی بعض مثالیں پیش کی جارہی ہیں۔

۱- سورۂ بقرہ کی آیت (۱۱۶) ہے:

وَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ○

ان اہل کتاب کا کہنا (یہ بھی) ہے کہ اللہ نے اپنا بیٹا بنایا ہے۔ پاک و برتر ہے وہ (اس بات سے) اس کے برعکس (امر واقعہ تو یہ ہے کہ) آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے، ہر ایک اس کا تابع فرمان ہے۔

اس آیت کے ذیل میں نصاریٰ کے عقیدہ 'مسیح ابن اللہ' پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ آخر میں فرماتے ہیں: ''ابنیتِ مسیح کی بابت تفصیلی گفتگو سورۂ مائدہ میں اپنے مقام پر آئے گی۔'' حاشیہ (۲۰۲)

۲- سورۂ بقرہ کی آیت (۱۴۰) ہے:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ○

پھر اس سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جو اپنے پاس کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے (سونپی ہوئی) شہادت کو چھپادے اور اللہ تعالیٰ تمھارے کرتوتوں سے بے خبر نہیں ہے۔

اس کی تشریح میں مولانا نے بتایا ہے کہ علماء اہل کتاب نے اللہ کی شہادت کو کس طرح تبدیل کیا اور نبی آخر الزماں سے متعلق جو شہادتیں موجود ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''انشاء اللہ تعالیٰ اس مسئلہ پر سورۂ اعراف کی آیت (۱۵۷) ''اَلَّذِیْنَ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِیْلِ'' کے تحت کسی قدر تفصیل سے گفتگو کی جائے گی۔ حاشیہ (۲۴۳)

۳- قصاص قتل کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ اس کا حکم پوری وضاحت اور تاکید کے ساتھ سورۂ مائدہ میں آیا (ہے) جس کی تفصیل اپنے موقع ہی پر آئے گی۔ حاشیہ (۳۱۵)

۴- سورۂ بقرہ آیت (۲۵۸) میں حضرت ابراہیمؑ اور نمرود کے مکالمہ کا ذکر ہے۔ اس کے ذیل میں مولانا نے لکھا ہے ''نمرود خود کو خدا کا اوتار سمجھتا تھا'' اس کے بعد فرماتے ہیں کہ اوتار کے نظریہ پر تفصیلی گفتگو سورۂ مائدہ کی ان آیتوں کی توضیح میں آئے گی جن میں اس عقیدہ کا براہِ راست ذکر آیا ہے۔ حاشیہ (۵۵۶)

۵- سورۂ بقرہ آیت (۲۷۳) میں صدقات کا ایک خاص مصرف یہ بیان ہوا ہے

کہ یہ (ان ناداروں) کے لیے ہیں جو اللہ کی راہ میں کچھ اس طرح گھر گئے ہیں کہ اپنی روزی کمانے کے لیے زمین میں دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔

اس کے ذیل میں لکھتے ہیں ''صدقات کے مصارف کئی ایک ہیں جن کی تفصیل سورۂ توبہ آیت (۶۰) میں آئے گی۔ حاشیہ (۵۹۷)

مولانا نے جس نہج پر یہ تفسیر لکھنی شروع کی تھی، اس کا تقاضا تھا کہ یہ پایۂ تکمیل کو پہنچتی، لیکن اسے علمی دنیا کا خسارہ ہی کہا جائے گا کہ یہ مبارک سلسلہ سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی تفسیر کے بعد منقطع ہو گیا اور ماہ نامہ 'زندگی' میں یہ اعلان شائع ہوا:

> ''بعض وجوہ کی بنا پر ترجمہ و تفسیر کا کام روک دیا گیا ہے، لہٰذا زندگی میں یہ سلسلہ ایک غیر متعین مدت کے لیے ملتوی رہے گا۔'' (ماہ نامہ زندگی، اگست، ستمبر ۱۹۵۳ء)

اس انقطاع کے متعین اسباب کا پتا لگانا مشکل ہے۔ جہاں تک مولانا کا تعلق ہے انھوں نے اس سلسلہ میں ہمیشہ سکوت اختیار کیا۔ کبھی کوئی بات نہیں کی۔ ہوسکتا ہے کچھ زیادہ اہم کام مولانا اور جماعت کے پیش نظر رہے ہوں جس کی وجہ سے وقتی طور پر اس سلسلہ کو روک دیا گیا ہو اور بعد میں اسے شروع کرنے کی نوبت نہ آئی ہو۔

مولانا صدرالدینؒ کی یہ تفسیر گوپردۂ خفا میں یا مخطوطہ کی شکل میں نہیں تھی، بلکہ تین سال تک ماہ نامہ 'زندگی' رام پور میں بالاقساط شائع ہوتی رہی، اس کے باوجود یہ ایک علمی ماہ نامہ کا حصہ بن کر رہی۔ ایک محدود حلقہ میں تو اس کا ذکر ہوتا تھا اور اس سے استفادہ بھی کیا جاتا تھا، مجھے یاد پڑتا ہے کہ استاذ محترم مولانا جلیل احسن ندویؒ مختلف مواقع پر اس کا حوالہ دیا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ علمی دنیا میں اس کی طرف وہ توجہ نہ ہوسکی جس کی وہ مستحق تھی۔ خود مولانا محترم اپنی نجی مجلسوں میں بھی اس کا ذکر نہیں فرماتے تھے۔ اس تفسیر کے بعد متعدد تصانیف مولانا کے قلم سے نکلیں اور قدیم تصنیفات کے نئے ایڈیشن شائع ہوئے، ان میں بھی اس کے حوالے نہیں ملتے۔ مولانا نے کبھی اس کی اشاعت کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ بہرحال دنیائے علم و ادب میں بعض اوقات غیر متوقع

واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ یہ بھی اسی طرح کا ایک واقعہ ہے کہ مولانا جیسے نام ور عالم دین کی تفسیر ترپن (۵۳) برس کے بعد اب کتابی شکل میں شائع ہو رہی ہے اور ایک بے مایہ اس پر پیش لفظ لکھ رہا ہے۔

مولانا فراہیؒ کا طریقۂ تفسیر

دورِ حاضر میں علامہ حمید الدین فراہیؒ کو علوم قرآن میں امامت کا مقام حاصل تھا۔ انھوں نے تفسیر قرآن کی نئی راہیں نکالیں اور قرآن مجید کو اصلاً قرآن ہی سے سمجھنے کی غیر معمولی کوشش کی۔ دیگر ذرائع تفسیر کو معاون ذرائع کی حیثیت دی اور اسی حیثیت سے ان سے فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے قرآن مجید کے نظم کو صرف ایک اصول کے طور پر ہی تسلیم نہیں کیا بلکہ اسے بہت ہی قوی دلائل سے ثابت کیا۔ ان کے نزدیک قرآن مجید کی ہر سورت کا ایک مرکزی موضوع ہے جس سے پوری سورت کے مضامین مربوط ہیں۔ پھر ان سورتوں کے درمیان بھی ربط ہے۔ اس ربط نے پورے قرآن کو از اول تا آخر ایک مسلسل کلام کی حیثیت دے دی ہے۔

فکر فراہی کی ترجمانی

مولانا صدر الدین اصلاحیؒ، فراہی اسکول کے ایک نمایاں فرد ہیں۔ انھوں نے 'تیسیر القرآن' میں مولانا فراہیؒ کے طریقۂ تفسیر کی پابندی کی ہے اور ان ہی کے وضع کردہ خطوط پر اسے مرتب کیا ہے۔ مولانا صدر الدین اصلاحیؒ کی تصنیفات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے سامنے مولانا فراہیؒ کی اس وقت تک کی تمام مطبوعہ تحریریں رہی ہیں اور غیر مطبوعہ مواد سے واقفیت کے بھی انھیں مواقع ملتے رہے ہیں اور انھوں نے اس سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ مولانا نے اپنے مقدمہ میں استاذ الاساتذہ علامہ حمید الدین فراہیؒ کا بڑے ہی احترام سے ذکر کیا ہے اور ترجمہ و تفسیر میں جو نئے نکات بیان ہوئے ہیں انھیں ان کا بالواسطہ فیض قرار دیا ہے۔ اس کے ساتھ مولانا فراہیؒ کے دو نام ور تلامذہ مولانا اختر احسن

اصلاحیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ ان کے اساتذہ میں شامل رہے ہیں۔ ان سے انھوں نے باقاعدہ قرآن مجید کا درس لیا ہے اور مولانا فراہی کی فکر کو سمجھنے اور جذب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح مولانا فراہیؒ سے مولانا صدرالدینؒ کا صرف ایک واسطہ سے تلمذ کا تعلق رہا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم تقسیم ہند کے بعد پاکستان منتقل ہوگئے، البتہ مولانا اختر احسن اصلاحی صاحب سے مولانا صدرالدین کا تعلق مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں باقاعدہ رہا ہے۔ ۱۹۵۰ء میں مولانا صدرالدین اصلاحی مرکز جماعت اسلامی ہند رام پور منتقل ہوگئے، لیکن مولانا اختر احسن اصلاحی سے ان کا ربط باقی رہا۔ یہ دونوں حضرات شروع ہی سے جماعت اسلامی ہند کی مجلس شوریٰ کے رکن رہے ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم کے انتقال تک ان حضرات کو بار بار ملاقات کا موقع ملتا رہا ہے۔ ان میں توقع ہے کہ قرآنی موضوعات اور قرآن کے مشکل مقامات پر بھی تبادلۂ خیال ہوتا رہا ہوگا۔(۱)

ایک بات یہ بھی مشہور ہے کہ ماہ نامہ 'زندگی' میں 'تیسیر القرآن' کے شائع ہونے سے پہلے مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم اسے دیکھ کر اپنے مشورے دیا کرتے تھے لیکن اس کی تصدیق نہیں ہوسکی۔ اگر اسے صحیح مان لیا جائے تو بھی یہ بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی کہ ہر قسط کے بارے میں مولانا اختر احسن صاحب کے مشورے حاصل ہوتے تھے یا کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا۔ اس وقت تفسیر جس شکل میں ہے اس سے مولانا اختر احسن مرحوم کی تفسیری آراء ہمارے سامنے بالکل نہیں آتیں۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ مولانا نے کسی بھی آیت کا کیا مفہوم بیان کیا اور مولانا صدرالدین نے اسے قبول کیا یا نہیں؟

---

(۱) یہ ناچیز جامعہ دارالسلام عمرآباد سے فراغت کے چند ماہ بعد جولائی ۱۹۵۴ء میں مزید استفادہ کے لیے مرکز جماعت اسلامی ہند رام پور پہنچا۔ مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم ۱۹۵۸ء میں اپنے انتقال تک مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاسوں میں شرکت کے لیے تشریف لایا کرتے تھے۔ شوریٰ سے فارغ اوقات میں اس عاجز کو مولانا اختر احسن مرحوم کی خدمت اور ان سے استفادہ کا موقع ملتا رہا ہے۔ مولانا بھی بہت شفقت فرمایا کرتے تھے۔ ان ملاقاتوں میں بالعموم قرآن مجید ہی تبادلۂ خیال اور غور وفکر کا موضوع ہوتا۔ اس طرح اس عاجز کو بھی مولانا اختر احسن اصلاحی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا شرف حاصل رہا ہے۔

فراہی اسکول کی پہلی تفسیر

علامہ حمید الدین فراہیؒ کی دو ایک تحریروں کے علاوہ تمام تصنیفات عربی زبان میں ہیں۔ ان میں سے بعض رسائل کا ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے قلم سے بہت پہلے شائع ہو چکا تھا۔ ان میں آخری پاروں کی بعض چھوٹی سورتوں کے ترجمے بھی شامل ہیں۔ مولانا فراہیؒ کے تلامذہ بھی اپنے مقالات اور مضامین میں ان کے خیالات کی ترجمانی کرتے رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود اردو داں طبقے میں مولانا فراہی کے خیالات عام نہیں ہو سکے تھے۔ 'تیسیر القرآن' مولانا فراہی کے نہج پر لکھی گئی پہلی اردو تفسیر ہے۔ اس کے ذریعہ کم از کم سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی حد تک مولانا فراہیؒ کے خیالات کا باقاعدہ تعارف ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا امین احسن کی تفسیر 'تدبر قرآن' میں مولانا فراہیؒ کے خیالات زیادہ تفصیل سے پیش ہوئے ہیں اور وہ قرآن مجید کی مکمل تفسیر ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تدبر قرآن کے ذریعہ ایک بڑے حلقہ میں اس نہج پر باقاعدہ غور و فکر کا آغاز ہوا، مولانا فراہی کی غیر مطبوعہ تحریریں سامنے آئیں اور ان کے تراجم اور خلاصے شائع ہوئے، لیکن مولانا صدر الدین اصلاحی اس سے بہت پہلے باقاعدہ تفسیر کا آغاز کر چکے تھے۔ اس لحاظ سے اسے شرف تقدم حاصل ہے۔ 'تدبر قرآن' اور 'تیسیر القرآن' میں بعض نکات مشترک بھی ملیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مولانا فراہی کی تحقیقات پر مبنی ہیں اور دونوں ہی بزرگوں نے ان سے استفادہ کیا ہے۔

مولانا مودودیؒ سے استفادہ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اسلام کا وسیع اور جامع تصور پیش کیا۔ غیر اسلامی افکار و نظریات کی کمزوری واضح کی اور اسلام کو دین حق ثابت کرنے کی بڑی مؤثر کوشش کی۔ مولانا مودودیؒ کو اللہ تعالیٰ نے منطقی ذہن، استدلالی قوت اور جان دار قلم عطا کیا تھا۔ انھوں نے وقت کے نمایاں مسائل سے تعرض کیا اور اسلامی فکر کو دلائل کے ساتھ پیش کیا۔

مولانا مودودیؒ کا فکر ان کی تفسیر 'تفہیم القرآن' میں سمٹ آیا ہے۔ وہ اپنی بعض ممتاز خصوصیات کی وجہ سے اس دور کی اردو زبان میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی تفسیر ہے۔اس کا ترجمہ بھی متعدد زبانوں میں ہو چکا ہے۔

مولانا صدرالدین اصلاحی کو مولانا مودودیؒ کی رفاقت حاصل رہی، انھوں نے مولانا کی وسیع فکر ہی کو نہیں اپنایا بلکہ ۲۶ راگست ۱۹۴۱ء کو مولانا مودودیؒ کی قیادت میں جماعت اسلامی کی تشکیل ہوئی تو انھوں نے آگے بڑھ کر اس کا ساتھ دیا۔ان کا شمار جماعت کے بالکل ابتدائی ارکان میں ہوتا ہے۔تقسیم ملک کے بعد وہ جماعت اسلامی ہند کے ایک ممتاز فکری رہنما کی حیثیت سے متعارف تھے۔ انھوں نے 'تفہیم القرآن' سے اپنی تفسیر 'تیسیر القرآن' میں بھرپور استفادہ کیا ہے۔اس طرح تیسیر القرآن میں فکرِ فراہی اور فکر مودودیؒ کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔مولانا صدرالدین نے بعض مسائل کی وضاحت کے لیے 'تفہیم القرآن' کے الفاظ مستعار لیے ہیں۔اس کی دو چار مثالیں یہاں پیش کی جارہی ہیں:

۱- وَ اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ط (البقرۃ:۳۰)

پھر (اس سلسلے میں) اس وقت کو بھی یاد کرو جب تمھارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں اپنا ایک خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں۔

خلیفہ کے بارے میں تفہیم کا یہ بیان 'تیسیر القرآن' میں نقل ہوا ہے:

''خلیفہ اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کی ملک میں اس کے سونپے ہوئے اختیارات اس کے نائب کی حیثیت سے استعمال کرے۔خلیفہ مالک نہیں ہوتا، بلکہ اصل مالک کا نائب ہوتا ہے،اس کے اختیارات ذاتی نہیں ہوتے، بلکہ مالک کے عطا کردہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنی ذاتی منشا کے مطابق کام کرنے کا حق نہیں رکھتا، بلکہ اس کا کام مالک کے منشا کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ خود اپنے آپ کو مالک سمجھ بیٹھے اور تفویض کیے ہوئے اختیارات کو

من مانے طریقے سے استعمال کرنے لگے یا اصل مالک کے سوا کسی اور کو مالک تسلیم کر کے اس کے منشا کی پیروی اور اس کے احکام کی تعمیل کرنے لگے تو یہ سب نمک حرامی، غداری اور بغاوت کے افعال ہوں گے۔''

(تفہیم القرآن جلد اول، حاشیہ ۳۸، ص ۶۲، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۱۹۹۹ء)

مولانا صدرالدین اصلاحی کے قلم سے اس کی مزید وضاحت کے بعد 'تفہیم القرآن' کے یہ الفاظ ہمیں ملتے ہیں:

''اس سلسلے میں انسان کی حقیقت اور کائنات میں اس کی حیثیت ٹھیک ٹھیک بیان کر دی گئی ہے اور نوعِ انسانی کی تاریخ کا وہ باب پیش کیا گیا ہے جس کے معلوم ہونے کا کوئی دوسرا ذریعہ انسان کو میسر نہیں ہے۔ اس باب سے جو اہم نتائج حاصل ہوتے ہیں، وہ ان نتائج سے بہت زیادہ قیمتی اور فلاح بخش ہیں، جنہیں زمین کی تہوں سے متفرق ہڈیاں نکال کر اور انھیں قیاس سے ربط دے کر اخذ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔''

(تفہیم القرآن جلد اول، حاشیہ ۳۶)

۲- حضرت آدمؑ کی توبہ کا ذکر ہے:

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ (البقرۃ:۳۷)

اس وقت آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھے (اور توبہ کی) تو اس نے اس کی توبہ قبول فرمائی یقیناً وہ بڑا ہی معافی دینے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اس آیت کے ذیل میں مولانا مودودیؒ نے وضاحت کی ہے کہ قرآن اس نظریے کی تردید کرتا ہے کہ گناہ کے نتائج لازمی ہیں اور وہ بہرحال انسان کو بھگتنے ہی ہوں گے۔ (تفہیم القرآن جلد اول، حاشیہ ۵۲، ص ۶۸)

'تیسیر القرآن' میں یہ پورا نوٹ نقل ہوا ہے۔

۳- آگے ارشاد ہے:

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا (البقرۃ: ۳۸) تم سب یہاں سے زمین پر جا اترو۔

اس فقرہ پر بھی تفہیم کی عبارت نقل ہوئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ توبہ کے بعد حضرت آدمؑ پر سے گناہ کا داغ دھل گیا اور وہ زمین میں بھیج دیے گئے تا کہ خلافت کا فریضہ انجام دیں۔ (تفہیم القرآن جلد ۱، حاشیہ ۵۳، ص ۶۸)

۴- سورہ بقرہ کی آیت (۲۰۸) کا ایک فقرہ ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ص — اے ایمان والو! (نبی کی) مکمل اطاعت میں داخل ہو جاؤ۔

اس کی تشریح میں تفہیم القرآن کے حسب ذیل الفاظ لیے گئے ہیں:

''یعنی کسی استثنا اور تحفظ کے بغیر اپنی پوری زندگی کو اسلام کے تحت لے آؤ۔ تمھارے خیالات، تمھارے نظریات، تمھارے علوم، تمھارے طور طریقے، تمھارے معاملات اور تمھاری سعی و عمل کے راستے سب کے سب بالکل تابع اسلام ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ تم اپنی زندگی کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے بعض حصوں میں اسلام کی پیروی کرو اور بعض حصوں کو اس کی پیروی سے مستثنیٰ کر لو۔'' (تفہیم القرآن جلد اول حاشیہ ۲۲۶، ص ۱۶۰)

۵- سورۂ بقرہ آیت (۲۱۸) میں ایک جگہ ایمان، ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ کی فضیلت ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ — وہ لوگ جو ایمان لائے جنھوں نے اللہ کی راہ میں اپنے وطن چھوڑے اور جہاد کیا وہ (بجا طور پر) رحمت الٰہی کے امیدوار ہیں۔ اللہ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اس آیت کے ذیل میں جہاد کے متعلق مولانا مودودیؒ نے لکھا ہے:

''جہاد کے معنی ہیں کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنی انتہائی کوشش صرف کر دینا۔ یہ محض جنگ کا ہم معنی نہیں ہے۔ جنگ کے لیے تو 'قتال' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جہاد اس سے وسیع تر مفہوم رکھتا ہے اور اس میں

ہر قسم کی جدوجہد شامل ہے۔ مجاہد وہ شخص ہے، جو ہر وقت اپنے مقصد کی دھن میں لگا ہو، دماغ سے اسی کے لیے تدبیریں سوچے، زبان وقلم سے اسی کی تبلیغ کرے، ہاتھ پاؤں سے اسی کے لیے دوڑ دھوپ اور محنت کرے، اپنے تمام امکانی وسائل اس کو فروغ دینے میں صرف کردے، اور ہر اس مزاحمت کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرے جو اس راہ میں پیش آئے، حتی کہ جب جان کی بازی لگانے کی ضرورت ہو تو اس میں بھی دریغ نہ کرے۔ اس کا نام ہے 'جہاد'۔ اور جہاد فی سبیل اللہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ صرف اللہ کی رضا کے لیے اور اس غرض کے لیے کیا جائے کہ اللہ کا دین اس کی زمین پر قائم ہو اور اللہ کا کلمہ سارے کلموں پر غالب ہو جائے۔ اس کے سوا اور کوئی غرض مجاہد کے پیش نظر نہ ہو۔''

(تفہیم القرآن جلد اول، حاشیہ ۲۵۴، ص ۱۶۶، ۱۶۷)

'جہاد' کی یہ پوری تشریح 'تیسیر القرآن' میں نقل ہوئی ہے۔

۶- سود کے سلسلے میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ط (بقرۃ:۲۷۵) اور اللہ نے تجارت کو جائز ٹھہرایا ہے اور سود کو حرام۔

تفہیم القرآن میں اس کی تشریح میں تفصیل سے تجارت اور سود کا معاشی اور اخلاقی لحاظ سے فرق واضح کیا گیا ہے۔ اسے مولانا صدر الدین نے اپنی تفسیر میں شامل کیا ہے۔

مولانا صدر الدین مرحوم نے تفہیم القرآن کے طویل اقتباسات بھی اپنی تفسیر میں لیے ہیں، ان میں تھوڑی بہت ترمیم بھی کی ہے اور کہیں صرف چند جملے اخذ کیے ہیں۔ ان کی کل تعداد بتیس (۳۲) ہے اور یہ تیسیر القرآن کے زیادہ سے زیادہ دس. بارہ (۱۰، ۱۲) صفحات پر مشتمل ہوں گے، لیکن مولانا نے جس فراخ دلی سے اپنے مقدمہ میں اس کا اعتراف کیا ہے وہ ان کی عظمت کی دلیل ہے۔

تیسیر القرآن کا اسلوب:

۱- مولانا صدر الدین اصلاحیؒ غیر مسلموں کے پیش نظر تفسیر لکھ رہے تھے۔ اس لیے انھوں نے، جیسا کہ خود صراحت کی ہے، بہت سے ان مباحث سے گریز کیا ہے، جو عام طور پر تفسیر کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ ان مباحث سے کسی ایسے شخص کو تو دلچسپی ہوسکتی ہے جو قرآن پر ایمان رکھتا ہو، لیکن ایک غیر مسلم کے لیے ان کی کوئی خاص اہمیت نہ ہوگی اور وہ اس کے لیے دل چسپی کا باعث نہ ہوں گے۔

۲- مولانا کا قلم بڑا ہی شائستہ اور مہذب ہے۔ کہیں بھی ثقاہت اور سنجیدگی کے منافی کوئی تعبیر بلکہ کوئی لفظ نہیں ملتا۔ ساتھ ہی ان کے ہاں زبان و بیان کا حسن اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے قرآن کے منشا اور مقصد کو صاف ستھرے اور واضح الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں وہ کامیاب ہیں۔ مولانا صدر الدین کے سامنے قرآن مجید کے سابقہ تراجم رہے ہوں گے، ان سے فائدہ بھی اٹھایا ہوگا، لیکن انھوں نے جو ترجمہ کیا ہے اس میں قرآن کے الفاظ کی پوری پوری رعایت بھی ہے اور مفہوم کی وضاحت بھی بخوبی ہو رہی ہے۔ اس طرح اس میں ایک انفرادیت پائی جاتی ہے۔ اس مضمون میں آیات کے ترجمے 'تیسیر القرآن' ہی سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اس سے ترجمہ کے حسن و خوبی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

۳- مولانا کے نزدیک نظم قرآن کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے آیات کے ترجمہ میں اس کی پوری رعایت کی ہے۔ ترجمہ کا مطالعہ کرتے وقت یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم ایک مربوط اور مسلسل مضمون کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ کہیں کوئی نیا مضمون شروع ہوتا ہے یا سابقہ مضمون اور بعد کے مضمون میں بہ ظاہر خلا نظر آتا ہے تو توضیحی کلمات اور حواشی کے ذریعے ربط کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کی ایک عمدہ مثال سورۂ بقرہ کی آیت (۱۷۸) 'كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ' کا حاشیہ ہے۔

اس آیت کے مطالعہ سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اچانک قصاص کے احکام

بیان ہونے لگے ہیں۔ سابقہ مباحث سے ان کا کوئی ربط و تعلق نہیں ہے۔ مولانا نے تفصیل سے بتایا ہے کہ اس کا تعلق پوری سورت کے مضمون سے ہے اور اس میں ایک معنوی ترتیب ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے خانۂ کعبہ کی تعمیر کے وقت اپنی ذریت میں ایک ایسے پیغمبر کی بعثت کی دعا کی تھی، جو انھیں اس کی آیات پڑھ کر سنائے، اس کے احکام کی تعلیم دے، حکمتِ دین سمجھائے اور ان کا تزکیہ کرے۔ اس دعا کے عین مطابق رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی۔ اس سورت کے مضامین کی ترتیب بھی وہی ہے جو حضرت ابراہیمؑ کی دعا میں ہے۔ ''اس آیت سے پہلے جو کچھ گزر چکا ہے وہ آیات کی تلاوت کا باب تھا، یعنی اس میں توحید اور قیامت اور رسالت کے بنیادی مسائلِ دینی پر دلیلیں دی گئی ہیں اور اب تعلیمِ احکام کا باب شروع ہو رہا ہے۔'' حاشیہ (۳۱۳)

۴- مولانا نے سورۂ بقرہ کا مرکزی موضوع اثباتِ رسالت محمدی قرار دیا ہے اور سورہ کے تمام مضامین کو اس سے مربوط دکھایا ہے۔

۵- مولانا نے اپنے مدعا کی وضاحت کے لیے حسبِ ضرورت قرآن کی آیات اور احادیث سے استشہاد کیا ہے، لیکن بالعموم وہ ان کے اصل الفاظ نقل نہیں کرتے، صرف ترجمہ یا ان کا مفہوم پیش کرتے ہیں۔

۶- مولانا نے کتبِ تفسیر میں سے کسی مفسر اور محقق کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ اسی طرح قرآن کے الفاظ و اصطلاحات کی تحقیق بھی کتب لغت کے حوالہ سے پیش نہیں کی ہے۔ اس لیے کہ پیش نظر مقصد کے لیے یہ کچھ زیادہ سودمند نہ تھی، البتہ کہیں کہیں مفسرین کی مختلف آراء کا ذکر کیا ہے۔ ذیل میں اس کی مثالیں دی جا رہی ہیں۔

۱- سورۂ بقرہ کی آیت (۷۳) میں ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص کا قتل ہوا۔ قاتل کا پتا نہیں چل رہا تھا تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا:

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۝

ہم نے حکم دیا کہ اس کو اس کے ایک حصہ سے ضرب لگاؤ (دیکھو) یوں اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کر دیتا ہے اور تمھیں اپنی نشانیاں دکھاتا رہتا ہے۔ تاکہ تم سمجھو۔

مولانا فرماتے ہیں: اس مجمل جملہ کی تفصیل کافی دشوار ہے، البتہ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ جس گائے کے ذبح کرنے کا اوپر ذکر آیا ہے یہاں اسی کا ذکر ہے۔ وہ اسی حادثہ کے سلسلے میں ذبح کرائی گئی تھی۔ اس کے ایک ٹکڑے سے مقتول کو ضرب لگانے کا حکم تھا۔ اس سے تھوڑی دیر کے لیے مردہ میں جان آ گئی اور اس نے اپنے قاتل کا نام بتا دیا۔ حاشیہ (۱۳۳)

۲- ہاروت و ماروت کے ذیل میں ارشاد ہے:

وَ مَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ ؕ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ ؕ

(البقرۃ:۱۰۲)

نیز اس چیز کی پیروی میں (منہمک ہو گئے) جو بابل میں ہاروت و ماروت نامی دو فرشتوں پر نازل کی گئی تھی (ان فرشتوں کا حال یہ تھا کہ) جب بھی کسی کو اپنا یہ فن سکھلاتے تو پہلے سے اس کو متنبہ کر دیتے کہ ''دیکھو! ہم تو آزمائش ہیں سو تم ہمارا (یہ آزمائشی فن سیکھ کر ہرگز) کفر کی راہ نہ اختیار کرنا'' (مگر اس تنبیہ کے باوجود یہ کج فطرت لوگ) ان سے وہ چیز سیکھتے رہے جس سے میاں بیوی میں جدائی ڈالنے لگے۔

ہاروت و ماروت کو جو علم دیا گیا تھا مولانا نے ترجمہ و تشریح کے ذریعے اس کو تفصیل سے واضح کیا ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:

''ہمارے اکثر مفسرینِ قرآن نے اس علم کو بھی جو ان دونوں فرشتوں کے ذریعے بنی اسرائیل کو سکھایا گیا تھا، جادو ہی کا علم قرار دیا ہے۔ مگر یہ بات متعدد وجوہ سے صحیح نہیں۔ ایک تو یہ کہ واو عطف کے ذریعے دو الگ الگ چیزیں بیان کی گئی ہیں۔ دوسرے یہ کہ جادوگری کی وبا تو یوں ہی ان میں پھیلی ہوئی تھی، پھر اس جدید اہتمام کی کیا حاجت تھی؟ تیسرے فرشتوں کو ایک کارِ حرام کے لیے بھیجا جانا کچھ غیر مناسب سی بات ہے۔ چوتھے فتنہ کا

اصل مفہوم جس کی توضیح ہم اوپر کر چکے ہیں، کسی طرح جادو اور شعبدہ کی تاویل کو قبول نہیں کرتا۔'' حاشیہ (۱۷۸)

۳- حج کے سلسلے میں ایک ہدایت یہ کی گئی ہے:

فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ (البقرۃ:۱۹۶)

لیکن اگر (کہیں راستے ہی میں) گھر جاؤ تو جو قربانی کا جانور میسر آئے (اللہ کی جناب میں پیش کرو) اور (اس وقت تک) اپنے سروں کو نہ منڈواؤ جب تک کہ وہ جانور اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔

اس کے ذیل میں مولانا فرماتے ہیں: ''جگہ سے مراد بعض علماء کے نزدیک کعبہ کے اردگرد کی وہ زمین ہے جہاں حج میں قربانیاں کی جاتی ہیں، اور بعض کے خیال میں یہ وہی جگہ ہے جہاں آدمی گھر گیا ہو۔ پہلا خیال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے ورنہ ''پہنچنے'' کا لفظ کیوں استعمال کیا جاتا۔ اب جو جانور اسے میسر آیا ہو خواہ اونٹ یا گائے یا بھیڑ یا بکری، اس کو کعبہ تک بھیجنے کی شکل یہ ہوگی کہ کسی جانے والے کے ہم راہ کر دے یا اس کو قیمت دے کر کہہ دے کہ وہاں پہنچ کر جانور خرید لینا اور میری طرف سے ذبح کر دینا۔ ذبح کرنے کا وقت بھی بتا دے اور جب یہ وقت آ جائے تو سر منڈا کر احرام کھول لے۔ اب آئندہ سال اس حج کو، جس کی نیت کی تھی مگر موانع کی وجہ سے ادا نہ کر سکا، از سر نو ادا کرے۔ حاشیہ (۳۷۰)

علمی مباحث:

تیسیر القرآن میں جگہ جگہ بڑے قیمتی مباحث اور خوب صورت تشریحات ملتی ہیں۔

۱- تفسیر کے شروع ہی میں 'اللہ' کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے:

''اللہ اسم ذات ہے اس ہستی کا جو تمام کائنات کی پیدا کرنے والی، دیکھ بھال کرنے والی اور براہ راست سب پر فرماں روائی کرنے والی ہے۔ وہ ہر کمال سے متصف اور ہر جمال کا سرچشمہ ہے۔ وہ اپنی صفات

میں یکتا اور بے مثل ہے۔ اس کو کسی چیز سے، کسی حیثیت سے بھی تشبیہ نہیں دی جاسکتی۔ وہ نہ تو جسم رکھتا ہے، نہ کوئی جسمانی قالب اختیار کرتا ہے، نہ کوئی چیز اس سے، یا وہ کسی چیز سے متحد ہوتا ہے۔ وہ ہر جگہ موجود، ہر شے سے واقف، ہر امر پر قادر ہے۔ ذرہ سے لے کر آفتاب تک، ہر چھوٹی بڑی چیز اسی کی، اور صرف اسی کی محکوم ہے اور سب اس کے سامنے یکساں طور پر عاجز اور بے بس ہیں۔'' حاشیہ(۱)

اس کی مزید وضاحت ایک اور جگہ ہمیں ملتی ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت (۱۳۳) میں کہا گیا ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے انتقال کے وقت اپنی اولاد سے سوال کیا مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ ؟ اس کے جواب میں ان کی اولاد نے کہا:

نَعْبُدُ اِلٰهَکَ وَ اِلٰهَ اٰبَائِکَ — ہم آپ کے اور آپ کے بزرگوں کے معبود کی بندگی کریں گے۔

مولانا نے 'الٰہ' کا پورا مفہوم، ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''وہ جس کے آگے جھکا جائے، جس کی پرستش کی جائے، جس سے دعائیں مانگی جائیں، جس سے حاجتیں طلب کی جائیں، جس کی پناہ ڈھونڈی جائے، جسے نفع اور نقصان کا مالک سمجھا جائے اور جو اپنے بالاتر اقتدار کی بنا پر اس کا مستحق ہو کہ انسان اس کی بندگی و اطاعت کرے اور اس کے آگے اپنا عجز و نیاز پیش کرے۔'' حاشیہ(۲۳۱)

۲- ابلیس نے حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ (البقرہ:۳۴)

مولانا فرماتے ہیں:

''ابلیس کے معنی ہیں انتہائی مایوس۔'' آگے چل کر فرماتے ہیں ''اس کا دوسرا نام شیطان بھی ہے، جس کے لفظی معنی ہیں 'ہلاک و نابود ہونے والا' یا 'دور ہونے والا'۔''

شیطان کے بارے میں ایک غلط خیال یہ ہے کہ اس کا کوئی متعین وجود یا شخصیت

نہیں ہے بلکہ وہ انسان کے اندر پائی جانے والی سرکش قوتوں کا نام ہے۔ مولانا کے نزدیک شیطان اور ابلیس کے الفاظ ہی اس غلط خیال کی تردید کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''ان الفاظ کے بعد غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ابلیس یا شیطان محض کسی مجرد قوت کا نام ہے بلکہ ایک ایسی ہستی ہے جو اپنی مستقل شخصیت رکھتی ہے۔'' حاشیہ (۵۳)

ابلیس کا حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار واضح ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

''ابلیس کے اس واقعہ سے اسلام کے تصور توحید کے متعلق ایک بڑی اہم حقیقت روشنی میں آتی ہے۔ عموماً لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو ایک ماننا اور اس کے سوا کسی کو سجدہ نہ کرنا ہی توحید کا کل مفہوم ہے۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو ابلیس سے بڑا موحد کون ہوسکتا تھا کہ فرمانِ خداوندی کے بعد بھی اس نے غیر اللہ کو سجدہ نہ کیا۔ مگر ہمیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اسی ''موحدانہ'' کارنامہ پر فاسق اور کافر قرار دے دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے تشریعی احکام کی اطاعت بھی جزوِ توحید ہے۔ اگر عقل کی نگاہ سے دیکھا جائے تو اس کا بدیہی فیصلہ بھی یہی ہوگا۔'' حاشیہ (۵۳)

۳- اللہ تعالیٰ نے سینا کے چٹیل میدان میں بنی اسرائیل پر بدلیوں کا سایہ کیا اور من وسلویٰ اتارا۔ (البقرہ:۵۷)

اس پر بحث کے ذیل میں مولانا نے اللہ کی رحمت کے ایک خاص پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے جو بالعموم نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے۔ کہتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے سورۂ ذاریات میں فرمایا ہے کہ ''انسان کا کام میری بندگی کرنا ہے اور اس کی روزی فراہم کرنے کا بار مجھ پر ہے۔'' جس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی افکار کا مرکز اللہ کی بندگی اور رضا جوئی ہونی چاہیے نہ کہ معاشی ضروریات و مادی ذرائع کی فراہمی۔ یہ کام دراصل دنیا کے پالن ہار کا ہے کہ اپنی چاکری کے کاموں میں مشغول بندوں کو روزی مہیا کرے۔

پس جو شخص یا گروہ خدا کی رضا جوئی میں جس حد تک منہمک ہوگا مخلوق کا پالنے والا روزی کمانے کی ذمہ داریاں اسی حد تک اس پر سے ساقط کردے گا، یہاں تک کہ اس سلسلے میں روزی حاصل ہونے کے عام اسباب کا پردہ بھی بیچ سے اٹھایا جاسکتا ہے جس کی واضح مثال یہ من وسلویٰ کا نزول ہے۔'' حاشیہ (۱۰۵)

۴- آگے اسی حقیقت پر آیت (۶۱) کے ذیل میں مزید روشنی ڈالی ہے۔ بنی اسرائیل نے کہا کہ ہم من وسلویٰ کھاتے کھاتے اکتا گئے ہیں۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اس کی جگہ زمین سے پیدا ہونے والی چیزیں عطا کرے۔ اس کے جواب میں حضرت موسیٰؑ نے فرمایا:

اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ط — کیا تم ایک بہتر چیز کو ادنیٰ شے سے بدلنا چاہتے ہو؟

اس کا مطلب بالعموم یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جن چیزوں کا تم مطالبہ کر رہے ہو وہ من وسلویٰ کے مقابلہ میں کم تر درجہ کی یا بے حیثیت چیزیں ہیں۔ تم ایک بہتر چیز کے مقابلہ میں کم تر چیز کی مانگ کر رہے ہو لیکن مولانا نے اس کا ایک دوسرا مفہوم بیان کیا ہے جو زیادہ بامعنیٰ ہے:

''اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ من وسلویٰ جیسی مزے دار اور بلا مشقت حاصل ہونے والی چیزوں کو چھوڑ کر ایسی چیزیں مانگ رہے ہو جو کم لذیذ ہیں یا پسینہ بہانے کے بعد ہی مل سکتی ہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی انتظام تمھیں فکر معاش سے آزاد کیے ہوئے ہے۔ ان حالات میں تمھیں اس کا ممنون کرم ہوتے ہوئے دعا کرتے رہنا چاہیے تھا کہ پروردگار! کرم کی یہ نگاہ یوں ہی باقی رہے تاکہ ہم ان مادی ضروریات کی فکر سے آزاد ہو کر اپنے زندگی کے اصل مقصد کے حصول میں پوری طرح مشغول رہیں اور ہمارا کام اس کے سوا اور کچھ نہ رہ جائے کہ ایک طرف تو

تیرے پیغمبر کے فیضِ تربیت سے فائدہ اٹھا کر اپنا دل پاک کریں، اپنے اخلاق سدھاریں، دین اللہ کی معرفت بڑھائیں اور اچھے اعمال کا نمونہ بن جائیں، دوسری طرف تیرے نورِ ہدایت کو لے کر آگے بڑھیں اور کفر و شرک سے تاریک فضاؤں میں اسے پھیلا دیں۔ پر افسوس ہے تمھاری پست نگاہی پر کہ بچوں کی طرح زبان کے چٹخاروں پر ریجھے جا رہے ہو۔ لذت پرستی کی ذلیل ذہنیت نے تمھیں زندگی کے پاک اور اصل مقصد سے اس درجہ بے گانہ کر رکھا ہے۔'' حاشیہ (۱۱۴)

۵- سورۂ بقرہ آیت (۹۹) کے الفاظ ہیں:

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۭ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ۭ

ہم نے تمھاری طرف ایسی آیتیں نازل کی ہیں جن کا آیاتِ الٰہی ہونا بالکل روشن ہے۔ ان کا انکار صرف فاسق ہی کر سکتے ہیں۔

اس کی تشریح میں مولانا نے اس غلط فہمی کا ازالہ فرمایا ہے کہ:

''قرآن دنیا کے ان تمام لوگوں کو یکساں طور پر فاسق قرار دیتا ہے جو اس پر ایمان نہیں رکھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن پر ایمان لانے کی ذمے داری دنیا کے کسی شخص پر اس وقت عائد ہوتی ہے جب وہ اس سے واقف ہو جائے اور اس کی دعوت اس تک پہنچ جائے۔ اس سے قبل وہ اس امر خاص میں خدا کے حضور جواب دہ نہیں ہو سکتا کہ وہ قرآن پر ایمان کیوں نہیں لایا... قرآن سے ناواقف فاسق نہیں بلکہ دراصل قرآن کا منکر فاسق ہے۔ یعنی وہ دشمن حق جس کو قرآن کی دعوت پہنچ چکی لیکن وہ ایمان نہیں لایا بلکہ وہ بدستور نفس پرستی، آبائی تقلید یا نسلی یا قومی عصبیت کا شکار بنا رہا۔'' حاشیہ (۱۷۰)

۶- سورۂ بقرہ کی آیت (۱۰۶) میں نسخ کا ذکر ہے۔ آیت کے الفاظ ہیں:

مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ اَوْ نُنْسِهَانَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا ط اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○

ہم (اپنی نازل کردہ) جس آیت کو بھی منسوخ کردیتے ہیں تو اس کے بجائے اس سے بہتر آیت، اور جس آیت کو بھلوا چکے ہوتے ہیں (اور اب اس کے ظاہر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے) تو اس کی جگہ ویسی ہی آیت نازل کردیتے ہیں۔ کیا تمھیں نہیں معلوم کہ اللہ ہر بات کی قدرت رکھتا ہے۔

اس آیت کے ذیل میں مفسرین نے دو باتیں کہی ہیں۔ ایک یہ کہ شریعت کے بعض احکام پہلے دیے گئے تھے وہ بعد میں منسوخ کردیے گئے تو فتنہ پرداز اعتراض کرنے لگے کہ کیا نعوذ باللہ، اللہ تعالیٰ سے غلطی ہوگئی تھی جس کی بعد میں اصلاح کی گئی۔ آیت میں اس کا جواب دیا گیا ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے بعض حضرات نے شریعت کے قانون نسخ کی تفصیل پیش کی ہے۔ آیت کے ذیل میں دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ اس میں یہود کے اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔ اعتراض یہ تھا کہ توریت اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب ہے۔ پھر قرآن اس کے بعض احکام کو کیوں منسوخ قرار دیتا اور اس کی جگہ دوسرے احکام پیش کرتا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن من جانب اللہ نہیں ہے، ورنہ اللہ کی ایک کتاب دوسری کتاب کے قوانین پر اس طرح خطِ نسخ نہ پھیرتی۔ آیت میں اسی کا جواب دیا گیا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۵۰-۱۵۱)

دوسری بات آیت کے سیاق وسباق سے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے۔ مولانا صدرالدین مرحوم نے یہی رائے اختیار کی ہے اور اتنی تفصیل سے اس پر گفتگو کی ہے کہ اس سے پہلے شاید کسی اور نے اس تفصیل سے بحث نہیں کی ہے۔ ملاحظہ ہو۔ حاشیہ (۱۸۶)

۷- حج کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ز وَ اتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ط (البقرۃ:۱۹۸)

(تقویٰ کا) زادِراہ جمع کرو کہ بہترین زادِراہ یہی تقویٰ ہے۔ لہٰذا اے عقل والو! میرا تقویٰ اختیار کرو۔

اس کا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ حج کے سلسلے میں سفر کی ضروریات کا اہتمام کیا جائے، بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے یعنی یہ کہ آدمی دوسروں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے اور ان پر بوجھ نہ بنے۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہونے کے باوجود حج کے سیاق سے بہت زیادہ مناسبت نہیں رکھتی۔ مولانا نے اس کی تشریح ایک نئے ڈھنگ سے کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ اہل عرب:

> ''حج'' کرنے کثرت سے آتے مگر حج کا مقصود کب کا بھلا چکے تھے، سچی خداپرستی کی روح سے ان کا حج بالکل خالی ہو چکا تھا۔ ''حج'' کرنے آتے مگر دنیا کمانے کی غرض سے، تجارتی منافع بٹورنے کے لیے اور سیر و تفریح کی خاطر۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا عبادتیں آخرت کی پونجی جمع کرنے کے لیے ہیں، نہ کہ دنیا کمانے کا آلہ۔ اس لیے حج کرنے آؤ تو پیش نظر خداپرستی کی روح پیدا کرنا ہو، تقویٰ کی روشنی سے دل کو منور کرنا ہو، آخرت کی سعادت اور فیروزمندی کے لیے خوش نودیِ رب کا ذخیرہ جمع کرنا ہو۔ معلوم ہوا کہ دوسرے احکام شرع کی طرح حج کا مقصد بھی اللہ کا تقویٰ پیدا کرنا ہے، وہ تقویٰ جو قرآن سے ہدایت پانے کی ایک ہی شرط ہے۔'' حاشیہ (۲۸۰)

آیت کے آخر میں ارشاد ہے کہ (اے عقل والو! میرا تقویٰ اختیار کرو) اس سے مولانا نے بہت عمدہ نکتہ نکالا ہے کہ:

> ''یہ اور اس طرح کی بہت ساری آیتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ دین اور تقویٰ عقل کا تقاضا ہیں، اور بنی نوع انسان کی عقل ہی اس ذمے داری کی بنیاد ہے۔ قرآن ان لوگوں کے نظریہ کی پرزور تردید کرتا ہے، جن کا خیال ہے کہ دین کا عقل سے کوئی تعلق نہیں، وہ صرف دل کے لطیف احساسات کی پیداوار ہے۔'' حاشیہ (۳۷۹)

۸- قرآن مجید نے انسانوں کے اُمت واحدہ ہونے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّـــةً وَّاحِـــــدَةً (درحقیقت) سارے انسان (ہمیشہ سے)
(البقرۃ: ۲۱۳) ایک ہی گروہ ہیں۔

اس آیت کا مفہوم مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ تمام انسان آغاز میں ایک امت تھے اور ان کا دین بھی ایک تھا۔ پھر ان میں اختلافات رونما ہونے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے ان اختلافات کو ختم کرنے اور حقیقت حال کو واضح کرنے کے لیے اپنے رسول بھیجے۔ یہ اختلافات بعد کی پیداوار ہیں جو دنیا کی طلب اور ظلم وعدوان کی وجہ سے رونما ہوئے، لیکن مولانا اسے یہاں ماضی کی جگہ ایک حقیقت واقعہ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک آیت میں بتایا گیا ہے کہ سارے انسان اپنی اصل کے لحاظ سے ایک ہیں اور ان کا دین بھی ہمیشہ ایک رہا ہے۔ اس حقیقت کو جاننے کے باوجود دنیا کی طلب میں اختلافات رونما ہوتے رہے اور پیغمبروں نے اس کی اصلاح کا فرض انجام دیا۔ مولانا نے اس آیت کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

''(درحقیقت) سارے انسان (ہمیشہ سے) ایک ہی گروہ ہیں اور (سب کے لیے ایک ہی دین ہے لیکن دنیا پرستی کی وجہ سے ان میں اختلافات رونما ہو گئے) تو اللہ نے (راست روی پر) بشارت دینے والے اور (کج روی پر) ڈرانے والے پیغمبر بھیجے، اور ان کے ساتھ پیغام حق رکھنے والی کتاب نازل فرمائی، تاکہ وہ ان اختلافات کا فیصلہ کر دے جس میں لوگ مبتلا ہو چکے تھے۔ اور (امر حق میں) یہ اختلافات ان ہی لوگوں نے کیے جن کو یہ حق بخشا جا چکا تھا (اور اس وقت کیے تھے) جب کہ روشن ہدایتیں ان کے پاس آئی ہوئی تھیں، (صرف) آپس میں (ایک دوسرے پر) زیادتی کرنے کی خاطر (انھوں نے ایسا کیا)۔ پس (اس وقت) جو لوگ (نبی پر) ایمان لائے، اللہ نے انھیں اپنے اذن سے اس حق کا راستہ دکھا دیا جس میں لوگ مختلف الرائے ہو گئے تھے۔ اللہ (اپنی حکمت اور سنت کے مطابق) جس کو چاہتا ہے راہ راست دکھاتا ہے۔''

مولانا نے حواشی میں اس کی جو تشریح کی ہے وہ بڑی قابل قدر ہے۔ فرماتے ہیں:

''قرآن کی یہ آیت ان بہت ساری آیتوں میں سے ایک ہے جو اعلان پر اعلان کرتی ہیں کہ سارے انسانوں کو ہمیشہ سے ایک ہی دین عنایت ہوتا رہا ہے۔ اصل دین میں ہرگز کوئی اختلاف نہیں ہوا۔'' حاشیہ (۴۰۶)

۹- آیت الکرسی (البقرہ: ۲۵۵) قرآن مجید کی بڑی اہم آیت ہے۔ مولانا صدرالدین اصلاحیؒ نے اس کی تفسیر میں شفاعت کے صحیح اور غلط تصور کی نہایت عمدہ وضاحت کی ہے۔

''جہاں قرآن نے اس شفاعت کی تردید کی ہے، جس کے مشرکین قائل تھے اور ہیں وہیں شفاعت کا اثبات بھی کیا ہے۔''

دونوں طرح کی شفاعتوں کے فرق کو مولانا نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''قرآن اس نظریۂ شفاعت کو رد کرتا ہے جو انسان کو عقیدۃً وعملاً خدا کے مقابلہ میں کسی مخلوق کے قریب لے جائے، اور اس تصور شفاعت کی توثیق کرتا ہے جو اسے ہر ماسوا کے مقابلہ میں خدا سے قریب کرے۔'' حاشیہ (۵۴۳)

اس کی وضاحت آگے اس طرح کی ہے کہ:

''پہلا نظریہ انسان کو یہ باور کراتا ہے کہ تیری فلاح اور بخشش عملی طور پر اصلاً فلاں بزرگ اور فرشتے (اور کسی) مخلوق کے ہاتھ میں ہے۔ کیوں کہ وہ بالذات تیری بخشش کا مالک اور صاحب امر نہیں، بلکہ اصل صاحب امر کے دربار میں بڑا زور اور اثر رکھتا ہے۔''

''اس کے بالمقابل دوسرا قرآنی تصور شفاعت انسان کو اس ٹھوس حقیقت سے دوچار کراتا ہے کہ سارا اقتدار اور فیصلے کا حق صرف خدا کو ہے۔ سب اس کے دربار میں یکساں مجبور ہیں۔ اس کے حضور زبان کھولنے کے لیے دو شرطیں ضروری ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ بولنے کی اجازت دے اور دوسرے

یہ کہ جو بات کہی جائے بالکل ٹھیک ٹھیک مطابق واقعہ کہی جائے، اسی لیے اگر کوئی شخص قیامت کے دن کسی کی شفاعت کرے گا بھی تو اس کی حیثیت صرف دعا اور التجا کی ہوگی اور وہ بھی اس وقت جب داورِ حقیقی اس کی اجازت دے۔''

عقلی انداز

مولانا صدرالدین اصلاحی کا اسلوب عقلی اور استدلالی ہے۔ قرآنی تعلیمات پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں انھیں رفع کرنے کی انھوں نے نہایت عمدہ کوشش کی ہے اور عقل کو مطمئن کرنے والے دلائل فراہم کیے ہیں۔ لیکن اس میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔ عام طور پر جن اصحابِ فکر پر عقلیت کا غلبہ ہوتا ہے وہ ان تمام امور کی توجیہ کرنے لگتے ہیں جنھیں وہ خلاف عقل سمجھتے ہیں۔ خواہ قرآن مجید کے الفاظ اس کا ساتھ دیں یا نہ دیں۔ اس کی زد میں بعض اوقات ملائکہ، جن اور شیاطین، وحی و رسالت اور برزخ جیسے حقائق اور ایمانیات بھی آجاتے ہیں۔ اسی میں انبیاءؑ کے معجزات بھی شامل ہیں۔ مولانا کی تفسیر اس مرعوبیت سے پاک ہے۔ ان تمام امور میں ان کے سامنے اصلاً الفاظِ قرآن رہے ہیں اور انھوں نے وہی تفسیر اختیار کی ہے جو قرآن کے الفاظ سے ہم آہنگ ہو یا جن کی الفاظ میں گنجائش ہو۔ اس سے باہر جانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اسے بعض مثالوں سے سمجھا جاسکتا ہے۔

۱- حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم کے لیے بحر احمر کے شق ہونے کا ذکر سورۂ بقرہ آیت (۵۰) میں ان الفاظ میں آیا ہے:

وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَ اَغْرَقْنَا اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ؕ

(یاد کرو وہ وقت) جب ہم نے تمھارے لیے سمندر کو پھاڑ دیا اور پھر (درمیان سے) تمھیں صحیح سلامت گزار دیا تھا، لیکن فرعونیوں کو تمھاری نگاہوں کے سامنے غرق کر دیا۔

اس کے ذیل میں مولانا کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے:

''اس موقع پر جب کہ کوئی انسانی تدبیر ممکن نظر نہیں آتی تھی، اپنے معمولی قوانین کے بجائے غیر معمولی قوانین کا حکم دیا اور سمندر یکایک اس طرح پھٹ گیا کہ بیچ میں خشک گزرگاہ نمودار ہوگئی اور دائیں بائیں پانی کی پہاڑیاں نصب ہوگئیں۔ حضرت موسیٰؑ مع اپنی پوری قوم کے خدا کا نام لے کر اس گزرگاہ سے ہوتے ہوئے دوسرے ساحل پر جا پہنچے۔ فرعون نے جو تعاقب کرتا ہوا اب ساحل پر پہنچ چکا تھا، سمندر کے بیچ سے انسانی گروہ کو گزرتے دیکھ کر خود بھی اپنا گھوڑا ڈال دیا، جب پورا لشکر اتر چکا تو دائیں بائیں کی 'آبی پہاڑیاں' باہم مل گئیں اور دیکھتے دیکھتے پورا لشکر غائب تھا۔'' حاشیہ (۹۳)

۲- سورۂ بقرہ کی آیت (۶۰) کے الفاظ ہیں:

وَ اِذِ اسْتَسْقٰی مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ

(یاد کرو وہ وقت) جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی کی درخواست کی تھی اور ہم نے کہا تھا کہ 'اپنی لٹھیا فلاں چٹان پر مار' چناں چہ (لٹھیا کا مارنا تھا کہ) اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور ہر گروہ کو یہ معلوم (بھی) ہوگیا کہ اس کے پانی لینے کی جگہ کون سی ہے۔

مولانا نے اسے بھی غیر معمولی اور غیر عادی واقعہ قرار دیا ہے۔

''سایہ اور غذا کی طرح پانی کا بھی غیر معمولی طور سے انتظام کیا گیا۔ بالکل معجزہ کے طور پر چٹان کا سینہ چاک ہوا اور پانی ابل پڑا، اور اس انداز سے ابلا کہ اگر بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے تو چشمے بھی بارہ ہی پھوٹے تاکہ پانی کی یہ تقسیم بھی خدا ہی کی طرف سے ہو جائے۔'' حاشیہ (۱۰۹)

اس کے بعد مولانا نے ان حیرت انگیز اور غیر عادی واقعات کی حکمت بھی بیان

فرمائی ہے۔

۳- بنی اسرائیل میں جن لوگوں نے سبت کے حکم کی خلاف ورزی کی تھی، اللہ نے ان کو جو سزا دی اس کا ذکر قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے:

وَ لَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ ۝ (البقرۃ:۶۵)

چناں چہ تمھیں اپنی قوم کے ان لوگوں کا قصہ بہ خوبی معلوم ہے جنھوں نے سبت کے معاملہ میں سرکشی اختیار کرلی تھی اور ہم نے (بطور عذاب) ان سے فرما دیا تھا کہ بن جاؤ بندر، ذلیل اور دھتکارے ہوئے۔

اس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ شکل وصورت کی تبدیلی نہیں تھی بلکہ ذہن و مزاج کی تبدیلی تھی، لیکن مولانا کہتے ہیں:

> ''ہوسکتا ہے کہ ان کی صورتیں نہ بدلی ہوں صرف باطن مسخ ہوکر بندروں جیسا ہوگیا ہو یا یہ صرف ایک مجازی تعبیر ہو ان کے ذلیل وخوار ہوجانے کی اور یہ بھی ممکن ہے کہ ظاہراً و باطناً دونوں حیثیتوں سے مسخ کرکے بالکل بندر بنادیے گئے ہوں اور یہ بھی قرین قیاس ہے کہ دماغ تو انسانوں جیسا دیا گیا ہو مگر صورتیں مسخ کردی گئی ہوں۔ یہی آخری شکل زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کیوں کہ اس شکل میں خود ان کو بھی اپنے ذہن میں یہ محسوس کرتے رہنے کا موقع تھا کہ یہ سب کچھ ہماری شرارتوں کا نتیجہ ہے۔'' حاشیہ (۱۲۶)

۴- بعض لوگ عالم برزخ کا انکار یا اس کے متعلق شکوک وشبہات کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ اسے اللہ تعالیٰ کے قانونِ عدل کے منافی سمجھتے ہیں، حالاں کہ برزخ کی زندگی قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔ مولانا صدرالدین کے ہاں وضاحت کے ساتھ برزخ کے عقیدہ کا ذکر ہے اور اس پر سورۂ بقرہ کی آیت (۱۵۴) سے استدلال کیا ہے۔ آیت کے الفاظ ہیں:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَاءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ط

ان لوگوں کو جو اللہ کے راستے میں قتل ہو جائیں مردہ نہ کہو وہ تو زندہ ہیں لیکن تمھیں (ان کی زندگی) کا شعور نہیں۔

مولانا لکھتے ہیں:

''قرآن اور حدیث دونوں سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد انسان بالکل ایسا مردہ نہیں ہو جاتا کہ اس کو حیات سے کوئی واسطہ ہی نہ ہو اور جب قیامت آئے گی اسی وقت جا کر اسے اس کامل حالتِ مرگ سے نکال کر دوبارہ زندگی عطا کی جائے گی، بلکہ اس دوران میں بھی اس کو ایک طرح کی جزوی زندگی حاصل رہتی ہے، جسے برزخی زندگی کہتے ہیں۔ اس زندگی میں بھی ہر شخص پر اس کے اعمال کے مطابق جنتی نعمتوں اور لذتوں کا یا پھر دوزخی مصیبتوں اور کلفتوں کا ترشح ہوتا رہتا ہے۔ یہاں اس آیت میں اسی زندگی کا ذکر ہے۔'' حاشیہ (۲۷۵)

۵- سورۂ بقرہ کی آیت (۲۵۹) میں ایک ایسے شخص کا ذکر ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حیات بعد الموت کا تجربہ کرایا تھا۔

اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّ هِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ط قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ط قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ط قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَ شَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ ۫ وَ

یا کیا اس شخص کے حال پر تم نے غور نہیں کیا جس کا گزر ایک بستی پر سے ہوا تھا، جو اپنی چھتوں کے بل ڈھئی پڑی تھی؟ (اسے دیکھ کر بے اختیار) اس کے منہ سے نکلا: ''یوں ہلاک ہو جانے کے بعد اللہ اس بستی کو دوبارہ کیسے زندہ کرے گا؟ اس پر اللہ نے سو برس کے لیے اس پر موت طاری کر دی، پھر اس کو (زندہ) اٹھا کھڑا کیا۔ دریافت کیا: ''تم (یہاں) کتنی دیر رہے؟'' بولا: ''ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ'' فرمایا: (نہیں) بلکہ تم

لِنَجْعَلَکَ آیَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ کَیْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَکْسُوْهَا لَحْمًا ط فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○
(البقرۃ:۲۵۹)

(یہاں اس حالت میں پورے) سو برس رہے ہو۔ سو اب ذرا اپنے کھانے پینے کی چیزوں کا جائزہ لو کہ ان پر سالہا سال گزر جانے کا کوئی اثر نہیں، دوسری طرف اپنے گدھے کو دیکھو (کہ اس کا پنجر تک بوسیدہ ہو رہا ہے)۔ (ہم نے تمھیں اپنی قدرت کا مشاہدہ اس لیے کرایا ہے تاکہ تم کو نور یقین حاصل ہو) اور اس لیے تاکہ ہم تمھیں لوگوں کے واسطے (بھی) ایک نشانی بنا دیں۔ اور پھر دیکھو کہ ہم کس طرح ہڈیوں کو اٹھا کر (ان کا ڈھانچہ بناتے اور) پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔'' جب اس کے سامنے حقیقت یوں بے حجاب ہوگئی تو بول اٹھا: ''مجھے یقین ہے کہ اللہ ہر بات پر قادر ہے۔''

بعض لوگوں کو اسے بھی غیر عادی اور معجزانہ واقعہ ماننے میں تأمل ہوسکتا ہے، لیکن مولانا نے اسے ایک غیر عادی واقعہ ہی کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ جس ہستی پر اللہ نے موت طاری کردی:

''ہوسکتا ہے کہ انھیں بالکل مردہ حالت میں رکھا گیا ہو اور اس کا بھی امکان ہے کہ ان پر ایک طویل نیند طاری کردی گئی ہو۔ قرآن میں نیند کے لیے موت کا استعمال یا استعارہ نایاب نہیں گو کم یاب ضرور ہے۔''
حاشیہ (۵۶۰)

یہ بات کہ سو برس گزرنے کے باوجود کھانے پینے کی چیزیں جوں کی توں رہیں اور دوسری طرف گدھے کا ڈھانچہ بوسیدہ ہو چکا تھا، اس پر مولانا لکھتے ہیں:

''گویا جس چیز پر موسمی حالات اور تغیرات کا نیز امتداد وقت کا اثر نسبتاً کچھ دیر میں ہوتا ہے (یعنی جانور) وہ تو یوں گل سڑ چکی تھی، مگر جس پر یہ اثر بہت جلد ہوتا ہے (یعنی کھانا یا پانی) وہ بدستور تر و تازہ موجود تھی۔ یوں اگر ایک شے اس امر کی شاہد تھی کہ یہاں کا قیام ایک لمبی مدت کا قیام ہو چکا

ہے، تو دوسری اس حقیقت کی گواہ تھی کہ قوانین قدرت اور عناصر فطرت اپنے فعل و تاثیر میں آزاد اور مستقل نہیں ہیں، بلکہ کسی بالاتر قوت (یا) قدرت الٰہی کے تابع فرمان ہیں، لہٰذا ضروری نہیں کہ عام قانونِ حیات کسی شے کو اپنے ضابطہ کے تحت فنا کی منزل پر پہنچا ہی دے اور جب یہ امر واقعہ ہے تو پھر کیا فرق ہے اس بات میں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت جب چاہے قوانین فطرت کو ان کے اپنے عمل سے روک دے اور اس بات میں کہ یہی قدرت عناصر طبیعت کو اس شے کی واپسی کا حکم دے دے، جس کے اجزاء بکھر کر ان کے معدوں میں جذب یا مستور ہو چکے ہیں۔ اور پھر یہ بکھرے ہوئے اجزاء اس کے حکم سے از سر نو سمٹ کر ایک مکمل قالب اور حسب سابق ایک زندہ جسم کی شکل میں تبدیل ہو جائیں۔'' حاشیہ (۵۶۲)

بعض اختلافی مسائل

مولانا صدر الدین نے اپنی تفسیر میں بعض اختلافی مسائل سے بھی تعرض کیا ہے۔ قرآن مجید نے منکرین حق کے بارے میں فرمایا (خٰلِدِیْنَ فِیْهَا) کہ وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔ مولانا فرماتے ہیں:

''مطلب یہ ہے کہ جب تک جہنم رہے گی۔ رہی یہ بات کہ جہنم کب تک رہے گی تو اس کی بابت قرآن صرف یہ بتاتا ہے کہ جب تک اللہ چاہے گا۔'' (ہود: ۱۰۷)، حاشیہ (۶۷)

اس سے خیال ہوتا ہے کہ مولانا غالباً جہنم کو ابدی نہیں سمجھتے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض علماء کی یہ رائے ہے، لیکن عام علماء اور محققین کے نزدیک جنت کی طرح جہنم بھی ابدی ہے۔

۲- اسلام کے جن احکام و مسائل پر اعتراض کیا جاتا ہے ان میں ایک قتل مرتد کا مسئلہ بھی ہے۔ اسے آزادیٔ فکر کے منافی سمجھا جاتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ کی عدم موجودگی میں بنی اسرائیل کے ایک گروہ کی گئو سالہ پرستی اور اس پر ان کی سزا کا ذکر سورۂ بقرہ (۵۴) میں ان الفاظ میں آیا ہے:

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰی بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَیْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ○

(یاد کرو وہ وقت) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ ''اے میری قوم کے لوگو! تم نے بچھڑے کو اپنا معبود بنا کر یقیناً اپنے اوپر (سخت) ظلم کیا ہے، پس اپنے خالق کے حضور توبہ کرو اور اپنے (اندر کے مجرموں) کو قتل کر ڈالو، اسی میں تمھارے خالق کے نزدیک تمھاری بھلائی ہے۔'' چناں چہ (اس وقت ایسا ہوا تھا کہ تمھاری عفو خواہی پر) اس نے تمھاری توبہ قبول فرمالی بلاشبہ اس کی درگزر اور رحم فرمائی بڑی بے پایاں ہے۔''

مولانا صدرالدین اصلاحی نے (فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ) کا جو ترجمہ کیا ہے بالعموم مفسرین نے ان الفاظ کے یہی معنی لیے ہیں۔ اس کے حاشیہ میں مولانا فرماتے ہیں:

''یعنی جن لوگوں نے اس شرک کا ارتکاب کیا ہے انھیں قانون شریعت کے مطابق ارتداد کی سزا دی جائے اور قتل کر دیا جائے۔'' حاشیہ (۹۷)

کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ توریت یا موسوی شریعت میں مرتد کی سزا قتل تھی، کیا توریت میں اب بھی یہ حکم موجود ہے؟ اس کے متعلق میں کچھ عرض نہیں کر سکتا، لیکن اگر یہ ثابت ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آخری رسول محمد ﷺ کی شریعت نے اس حکم کو باقی رکھا جو پہلے سے توریت میں موجود تھا۔

۳- دیت کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں کہ:

''آزاد، غلام اور عورت میں سے ہر ایک کے خون کی قیمت کیا ہوگی تو شریعت نے اس کی کوئی تعیین نہیں فرمائی ہے بلکہ اسے دستور عام پر چھوڑ دیا ہے۔ جس ملک یا سوسائٹی میں اہل الرائے کے درمیان جو قیمتیں طے قرار پا جائیں، شریعت کے نزدیک وہی قیمتیں قابل تسلیم ہوں گی۔'' حاشیہ (۳۶)

عام طور پر علماء نے حدیث کی بنیاد پر دیت سو اونٹ مانی ہے۔ اونٹ کی قیمت بھی

ادا کی جاسکتی ہے۔ آزاد، غلام اور عورت کی دیت میں کوئی فرق ہے یا نہیں، اس پر بھی اہل علم نے بہت تفصیل سے بحث کی ہے۔ مولانا کی اس رائے کو ایک صاحب علم کی رائے کی حیثیت سے دیکھا جاسکتا ہے۔

اصلاح امت

مولانا کی تفسیر کا انداز خالص علمی ہے۔ اس میں ملکی و غیر ملکی حالات، سیاسی تغیرات اور امت کے مسائل کا ذکر نہیں ملتا، لیکن کہیں کہیں امت کی کم زوریوں کی طرف اشارے کیے گئے ہیں اور اصلاح حال کی دعوت دی گئی ہے۔ سورۂ بقرہ کے آغاز ہی میں قرآن مجید کے بارے میں فرمایا گیا (هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ) یعنی یہ سراپا ہدایت ہے ان لوگوں کے لیے جن کے اندر تقویٰ ہے۔

مولانا نے تقویٰ کی تفصیل سے وضاحت کی ہے۔ اس کے آغاز میں فرماتے ہیں کہ یہ قرآن کی ایک خاص اصطلاح ہے اور اس سے مراد انسان کے دل کی وہ کیفیت ہے جو اس کو ہر لحہ اس بات پر آمادہ رکھتی ہے کہ وہ اپنے محسن حقیقی کے احسانوں کو یاد رکھے، ان کے تقاضوں سے غافل نہ ہو۔

اس کے بعد قرآن نے متقیوں کی صفات بیان کی ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ:

> ''قرآن نے یہاں جو انداز بیان اختیار کیا ہے اس پر انھیں (مسلمانوں کو) گہری نظر ڈال کر محسوس کرنا چاہیے کہ ہدایت کا مفہوم کتنا وسیع ہے، اور کس طرح وہ پوری زندگی کو گھیرے ہوئے ہے۔ ہدایت صرف اس چیز کا نام نہیں کہ آدمی بس خدا اور آخرت پر اپنے اعتقاد کا اظہار کر دے اور جوں توں کر کے نماز پڑھ لے اور زکوٰۃ دے دے، بلکہ اس کا تعلق انسان کی زندگی کے ایک ایک شعبے اور ایک ایک معاملے سے ہے..... ورنہ اگر ہدایت یافتگی کا مطلب صرف یہ ہوتا کہ انسان توحید، رسالت اور آخرت کا اقرار کرے اور نماز روزے کی پابندی اختیار کرے، جیسا کہ تنگ نظر لوگ سمجھے بیٹھے ہیں، تو قرآن کے اس قول کے کوئی معنیٰ نہیں رہ جاتے کہ یہ کتاب ان لوگوں کے لیے ہدایت ہے جو ایسا ایسا کرتے ہیں۔ کیوں کہ وہ ایسا ایسا کر کے

ہدایت یاب ہو ہی چکے ہیں۔ انھیں اب قرآن کیا ہدایت بخشے گا؟'' حاشیہ(۱۰)

اس طرح کے بعض اور بھی مقامات ہیں جہاں مولانا نے مسلمانوں کو ان کی خامیوں کی نشان دہی کی ہے اور اصلاح کی طرف متوجہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: حاشیہ(۶۸)

مولانا صدر الدین اصلاحیؒ میرے استاذ اور مربی تھے۔ ۱۹۵۴ء میں ان سے تعارف حاصل ہوا اور ۱۹۵۶ء سے بہت ہی قریبی تعلق قائم ہو گیا۔ میں نے ان کی راہ نمائی اور نگرانی میں اپنا تصنیفی سفر شروع کیا۔ پندرہ برس تک مولانا کی صحبت و رفاقت اس طرح حاصل رہی کہ استفادہ اور تبادلۂ خیال میں کوئی ادنیٰ رکاوٹ کبھی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ۱۹۷۰ء میں مولانا اپنے وطن پھول پور اعظم گڑھ منتقل ہو گئے۔ اس کے بعد بھی انتقال کے وقت تک مولانا سے مسلسل ربط و تعلق رہا اور فائدہ اٹھانے کے مختصر اور طویل وقفے فراہم ہوتے رہے۔ میں نے 'تیسیر القرآن' سے طالب علمانہ استفادہ کیا ہے اور اس کے بعض خاص پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسے اس تفسیر کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ کام زیادہ باصلاحیت افراد کر سکتے ہیں۔

اس وقت خوشی اس امر کی ہے کہ استاذ محترم کی تفسیر 'تیسیر القرآن' کو جو عملاً مسودہ کی شکل میں تھی، مولانا کے صاحب زادے برادرم ڈاکٹر رضوان احمد فلاحی سلمہ نے بڑی محنت سے اور جدید ڈھنگ سے مرتب کیا ہے۔ مولانا نے جگہ جگہ اپنے مدعا کی وضاحت کے لیے آیات و احادیث سے استشہاد کیا ہے۔ انھوں نے ان کا صرف مفہوم بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ حوالے نہیں دیے ہیں۔ رضوان احمد سلمہ نے ان کے حوالے فراہم کیے ہیں۔ اسی طرح جن دیگر کتب سے تفسیر میں استفادہ کیا گیا ہے ان کے حوالے بھی پیش کیے گئے ہیں۔ مولانا نے مختلف آیات پر بعض سوالات کے جوابات میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ اسی طرح قرآن ہی سے متعلق مضامین بھی لکھے ہیں، بعض وضاحتیں مولانا کی تصنیفات میں ملتی ہیں، ان سب کو رضوان احمد سلمہ نے ضمیموں کی شکل میں بڑے سلیقہ سے جمع کر دیا ہے۔ اب یہ کتاب بالکل جدید طرز پر ہمارے سامنے آ رہی ہے۔ اللہ عزیز موصوف کو جزائے خیر دے اور مزید علمی خدمت کی توفیق عنایت کرے۔

○

اندلس میں فقہی مذاہب کا تعارف اور ارتقاء

——— جناب محمد احمد زبیری

مذہبِ اوزاعی

اندلس میں فقہی مذاہب کے تعارف اور فروغ کے ذیل میں سب سے پہلے مذہب اوزاعی سامنے آتا ہے۔ امام اوزاعی عبدالرحمٰن بن عمروؒ (م ۱۵۷ھ) تابعین کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ نہایت دین دار، بلند اخلاق کے حامل اور فصیح اللسان تھے۔ تحصیلِ علم کے لیے انھوں نے کئی سفر کیے۔ یحییٰ بن کثیر سے حدیث کی سماعت کی اور ایک عرصے تک ان کے ہاں قیام پذیر رہے۔[۱] بصرہ میں حسن بصریؒ اور محمد بن سیرینؒ سے استفادہ کیا۔[۲] امام اوزاعیؒ کے مذہب کی بنیاد قرآن وسنت پر ہے۔ وہ قیاس کے قائل نہیں ہیں۔ ان کا مذہب شام، مراکش اور اندلس میں پھیلا، لیکن شام میں شافعی مذہب نے غلبہ حاصل کیا اور مراکش اور اندلس میں مالکی مذہب کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ اندلس میں اوزاعی مذہب کے فروغ اور تعارف کی خدمت، کتب تاریخ اور دیگر علمی مصادر کے مطابق صعصعہ بن سلام (م ۱۹۲ھ) نے انجام دی۔[۳] صعصعہ بن سلام دمشق سے قرطبہ منتقل ہوئے اور منصب قضاء اور افتاء پر فائز کیے گئے۔ اندلس میں تقریباً چالیس سال تک اوزاعی مذہب غالب رہا، اس کے بعد تیسرے اموی خلیفہ حکم بن ہشام کے زمانے میں امام مالک (م ۱۷۹ھ) کے مذہب نے غلبہ حاصل کیا۔

مذہبِ مالکی

اندلس میں مالکی مذہب کے تعارف اور فروغ کے ذیل میں ابن القوطیہ[۴] لکھتے ہیں:

ان الذی أدخل مذهب الامام مالک و کان عنصراً فعالا فی تحویل أهل الاندلس الی هذ المذهب هو عبد الملک بن حبیب السلمیٰ .۵

جس شخص نے سب سے پہلے اندلس میں مالکی مذہب کو داخل کیا اور اہلِ اندلس کو مالکی مذہب قبول کرنے میں فعال عنصر کا کردار ادا کیا وہ عبدالملک بن حبیب السلمی ہیں۔

شکیب ارسلان کی رائے ہے کہ اندلس میں مالکی مذہب کو متعارف کرانے والے زیاد بن عبدالرحمٰن اللخمی ہیں جو شبطون کے لقب سے مشہور ہیں۔ شکیب ارسلان کے مطابق زیاد بن عبدالرحمٰن نے سب سے پہلے اندلس کو مؤطا سے متعارف کرایا۔۶

مالکی مذہب نے اندلس میں بہت مقبولیت حاصل کی۔ مالکی فقہاء اندلس کی سیاسی تاریخ میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے بڑے اہم مناصب حاصل کیے اور ان کا حکومت کے اندر اثر و رسوخ بہت بڑھ گیا تھا۔ ہشام بن عبدالرحمٰن کے زمانے میں امور سلطنت کے اندر مالکی فقہاء کی مداخلت عروج پر پہنچ گئی تھی۔۷

ہشام نے یحییٰ بن یحییٰ کو قضاء کا منصب پیش کیا۔ انھوں نے قاضی بننے سے انکار کر دیا، لیکن اندلس میں تمام قاضی ان کے مشورے اور منظوری کے بعد متعین کیے جاتے تھے اور وہ صرف مالکی فقہاء کو قضاء کے منصب کے لیے منتخب کرتے تھے۔

مقری (م ۱۰۴۱ھ) ابن حزم کے حوالے سے لکھتے ہیں:

مذهبان انتشرا فی بدء امر هما بالریاسة والسلطان: مذهب أبی حنیفة فانه ولی القضاء أبو یوسف و کانت القضاة من قبله من اقصی المشرق إلیٰ اقصی عمل افریقیة، فکان لایولی إلا اصحابه والمنتسبین إلی مذهبه، ومذهب مالک عندنا بالاندلس، فان

دو مذاہب اپنے آغاز میں ریاست اور حکومت کی وجہ سے پھیلے، ایک امام ابوحنیفہ کا مذہب جو ابو یوسف کے قاضی القضاۃ بننے کی وجہ سے پھیلا، مشرق سے لے کر افریقہ کے دور دراز علاقوں تک تمام قاضی ان کی طرف سے مقرر کیے جاتے تھے اور وہ صرف اپنے ساتھیوں یا حنفی مسلک کی طرف منسوب فقہاء کو

يحيىٰ بن يحيىٰ كان مكينا عند السلطان، مقبول القول في القضاء، وكان لا يولى قاضيا في أقطار الاندلس إلا بمشورته واختياره وكان لا يولى الا المالكيين.

قاضی مقرر کرتے تھے۔ دوسرا مذہب، امام مالک کا ہے جو ہمارے ہاں متداول ہے۔ یحییٰ بن یحییٰ کی سلطان (بادشاہ) کے ہاں بہت قدر ومنزلت تھی اور قضاء کے بارے میں ان کی رائے کو اہمیت دی جاتی تھی۔ اندلس کے تمام علاقوں میں ان کے مشورے اور انتخاب کے بغیر کسی کو قاضی مقرر نہیں کیا جاتا تھا۔ یحییٰ بن یحییٰ مالکی فقہاء کے علاوہ کسی کو قاضی مقرر نہیں کرتے تھے۔

اندلس میں بلاشرکت غیرے مالکی مذہب غالب رہا۔ جس کی وجہ سے ملک کے اندر فرقہ واریت اور مسلکی اختلافات کو فروغ پانے کا موقع نہیں ملا۔ اس پہلو سے اندلس کی تاریخ میں مذہبی منافرت، مناظرے اور باہمی جنگ وجدال کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔

اندلس میں مالکی مذہب کے فروغ کے کئی اسباب ہیں:

پہلا سبب سیاسی ہے۔ ہشام بن عبدالرحمٰن علماء کا قدردان تھا۔ وہ علمی مجالس میں شریک ہوتا اور علماء سے استفادہ کرتا۔ ہشام بن عبدالرحمٰن، امام مالکؒ کا ہم عصر تھا۔ امام مالک کی سیرت وکردار اور علمی مقام ومرتبے سے وہ بہت متاثر تھا۔ اس کے علاوہ اندلس کے علماء نے جب ہشام بن عبدالرحمٰن کو امام مالک کی قدر ومنزلت اور علمی رتبے سے واقفیت بہم پہنچائی تو وہ اور بھی متاثر ہوا۔ ان علماء میں زیاد بن عبدالرحمٰن اللخمی (م ۱۹۹ھ) عیسیٰ بن دینار اور یحییٰ بن دینار اور یحییٰ بن یحییٰ اللیثی (م ۲۳۸ھ) قابل ذکر ہیں۔

اس کے علاوہ بنوعباس سے نفرت اور خصوصاً مدینہ کے علویوں سے ابوجعفر منصور کے سلوک کو دیکھ کر ہشام بن عبدالرحمٰن حنفی مذہب کی بجائے مالکی مذہب کو پسند کرنے لگا۔ بنوعباس سے نفرت ایک قدر مشترک ثابت ہوئی۔ مالکی مذہب کے فروغ میں یحییٰ بن یحییٰ اللیثی کا کردار نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ یحییٰ بن یحییٰ کے علمی مقام، ان کی دین داری اور دنیا سے بے رغبتی کے باعث خلفاء اور امراء کی نظروں میں ان کی بڑی عظمت تھی اور ان کا

بڑا احترام کیا جاتا تھا۔

یہ فطری بات ہے کہ جب اندلس میں تمام قاضی مالکی مذہب کے متعین کیے جانے لگے تو طلبہ اور علماء کے اندر مالکی مذہب سے واقفیت کا جذبہ اور شوق پیدا ہوا۔ قاضی اور دیگر مناصب کے حصول کے لیے چوں کہ مالکی ہونا شرط قرار پایا اس لیے اندلس کے اندر مسالک اور مذاہب کا وہ تنوع نظر نہیں آتا جو بلادِ مشرق کا خاصہ ہے۔

مالکی مذہب کی مقبولیت کے کچھ دیگر اسباب بھی ہیں جن کی طرف ابن خلدون (م ۱۴۵۶ھ) نے اپنی تاریخ میں اشارہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

ان البداوة كانت غالبة على اهل المغرب والاندلس ولم يكونوا يعانون الحضارة التى كانت لاهل العراق فكانوا الى اهل الحجاز اميل لمناسبة البداوة .	اہل مغرب اور اہل اندلس پر بدویت غالب تھی۔ وہ اہلِ عراق کی طرح تہذیب وتمدن سے آشنا نہیں تھے۔ اس لیے اہلِ حجاز سے زیادہ فطری لگاؤ رکھتے تھے۔

اندلس میں فقہ مالکی کے فروغ کا ایک اہم سبب حج ہے۔ اندلس کے علماء فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے جاتے اور اہلِ حجاز سے پوچھتے کہ سب سے بڑا عالم کون ہے؟ انھیں جواب ملتا کہ امام مالکؒ سے بڑا عالم کوئی نہیں۔ اس لیے اہلِ اندلس امام مالک سے استفادہ کرتے اور وطن واپسی کے بعد ان کے علوم ومعارف اور فقہی اصولوں کی تعلیم وتدریس کرنے لگتے۔ بہت کم علماء دیگر مراکز علمیہ کی طرف رجوع کرتے۔ اس لیے اندلس میں سب سے زیادہ فقہ مالکی کو فروغ حاصل ہوا۔

مذہبِ ظاہری

فقہ مالکی کے بعد ظاہری مذہب کا تذکرہ ضروری ہے۔ یہ مذہب داؤد بن علی بن خلف اصفہانی کی طرف منسوب ہے جو ظاہری لقب سے مشہور ہوئے۔ داؤد بن علی ۲۷۰ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے اور بغداد میں پلے بڑھے۔ ابتدا میں شافعی تھے۔ انھوں نے امام

شافعی (م۲۰۴ھ) کے فضائل ومناقب پر ایک کتاب بھی لکھی۔ انھوں نے سب سے پہلے شریعت میں ظاہری مفہوم کی اہمیت پر زور دیا۔ قیاس کی شدت کے ساتھ مخالفت کی۔ ان کی رائے میں نصوص کے ظاہر سے جو مفہوم ذہن میں آتا ہے اس پر عمل کرنا واجب ہے۔ کسی تاویل یا علت اور حکمت کی بنیاد پر ظاہری مفہوم کو چھوڑ کر اور کوئی مفہوم لینا یا نصوص کی کوئی اور تفسیر وتشریح کرنا وہ درست نہیں سمجھتے تھے۔

مشرق میں ان کی تصنیفات اور ان کے شاگردوں کی وجہ سے ان کا مذہب پھیلا۔ تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں ان کا مذہب حنفی، مالکی، اور شافعی مذاہب کے بعد چوتھا بڑا مذہب بن گیا۔[۸] اندلس میں ظاہری مذہب کی اشاعت کے حوالے سے حمیدی (م۴۸۸ھ) لکھتے ہیں:

إن أول من أدخل هذاالمذهب الىٰ الأندلس عبد الله بن محمد بن قاسم بن هلال (م۲۹۲ھ) وكان مالكيا ثم تتلمذ على يد داؤد الظاهري ونسخ كتبه وأقبل بها على أهل الأندلس واجتهد في نشرها.

اندلس میں سب سے پہلے عبداللہ بن محمد بن قاسم بن ہلال (۲۹۲ھ) نے اس مذہب کو متعارف کروایا۔ یہ پہلے مالکی تھے بعد ازاں داؤد ظاہری سے استفادہ کیا۔ انھوں نے داؤد ظاہری کی کتابوں کو نقل کیا اور اپنے ساتھ اندلس لے کر آئے اور اس مذہب کی اشاعت کی بھر پور کوشش کی۔

اہلِ اندلس میں ظاہری مذہب کے فروغ میں منذر بن سعید البلوطی (م۳۵۵ھ) کا نام بھی آتا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں سب سے اہم کردار ابن حزمؒ (م۴۵۶ھ) نے ادا کیا۔

امام ابن حزمؒ

ابن حزمؒ بہت بڑے عالم تھے۔ ان کے پائے کا کوئی عالم اندلس میں نہیں تھا۔ ان کی معلومات بے انتہا، شخصیت انتہائی جاذب اور پرکشش اور زبان فصیح تھی اور ذہانت اور

معاملہ فہمی میں کوئی ان کا مدمقابل نہیں تھا۔ان کے بارے میں ذہبی لکھتے ہیں:

وكان إليه المنتهى فى الذكاء	ذہانت وفطانت ان پر ختم تھی۔کتاب
وحدة الذهن وسعة العلم	وسنت کا وسیع علم رکھتے تھے، مذاہب اور
بالكتاب والسنة والمذاهب	ملل ونحل کی معرفت، عربی زبان وادب،
والملل والنحل والعربية	منطق اور شاعری میں ماہر تھے۔
والآداب، والمنطق، والشعر، مع	صداقت ودیانت شان وشوکت،
الصدق والديانة والحشمة،	قیادت اور سرداری اور تونگری جیسی
والسؤدد والرياسة والثروة".[9]	خوبیوں سے مالا مال تھے۔

ابن حزمؒ کو اللہ تعالیٰ نے اتنی خوبیاں دی تھیں کہ بہت کم لوگوں کو وہ حاصل ہوتی ہیں۔اس کے علاوہ وہ اپنی رائے کے اظہار اور حق کے بیان کرنے میں کسی مصلحت کا شکار نہیں ہوتے تھے۔دین کے بارے میں جو کچھ وہ حق اور صحیح سمجھتے تھے اس کا اظہار کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ یا تردد محسوس نہیں کرتے تھے۔انھیں اس بات کی پروا نہیں تھی کہ ان کی رائے امام مالک (م۱۷۹ھ)، امام ابوحنیفہ (م۱۵۰ھ) یا امام شافعی (م۲۰۴ھ) کی آراء کے مطابق ہے یا مخالف ہے؟ نہ انھوں نے یہ خیال کیا کہ اپنی رائے کے ظاہر کرنے سے میں ان ائمہ کے پیروکاروں کی ناراضی مول لے رہا ہوں۔اس لیے انھیں ساری زندگی ابتلاء وآزمائش کا سامنا کرنا پڑا اپنے مخالفین کے رویے اور اپنے مسلک کی ترجمانی کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

قالوا تحفظ فإن الناس قد كثرت
أقوالهم وأقاويل العدا محن
فقلت: هل عيبهم لى غير إنى لا
أقول بالرأى إذ فى رأيهم فتن
وأننى مولع بالنص لست إلى
سواه أنحو ولا فى نصره أهن

لا أثنـــی نـحـو آراء یـقـال بهـا
فی الـدین بل حسبی القرآن والسنن
یـابـردا ذا القول فی قلبی وفی کبدی
ویـا سـروری بـه لـو إنهم فـطـنـوا

(وہ مجھے مشورہ دیتے ہیں کہ احتیاط سے کام لو، کیوں کہ لوگوں کے اقوال اور مسالک کی کثرت ہوگئی ہے اور دشمنوں کے اقوال ابتلاء اور آزمائش کا سبب بنتے ہیں۔

میں انھیں جواب دیتا ہوں: کیا میرا عیب صرف یہ ہے کہ میں اپنی رائے سے کوئی بات نہیں کرتا، جب کہ ان کی آراء فتنوں سے بھرپور ہیں۔ میں تو نص (قرآن وسنت) پر فریفتہ ہوں نہ اس سے صرف نظر کرتا ہوں اور نہ نص کی تائید میں کوتاہی کرتا ہوں۔

نہ دین کے بارے میں دیگر آراء کی طرف التفات کرتا ہوں بلکہ میرے لیے قرآن اور سنت ہی کافی ہیں۔

میرے دل اور جگر میں کس قدر طمانیت کی ٹھنڈک ہے! اور میں کس قدر مسرور اور شادمان ہوں! کاش وہ اس کا اندازہ کر سکتے۔

ابن حیان (م ۴۵۶ھ)، ابن حزم کے بارے میں لکھتے ہیں:

إنه یصک معارضه صک الجدل فکان لایأبه من یعارضه، عظیما أو غیر عظیم، مبجلا أو غیر مبجل کالأشعری، وأبی حنیفة، ومالک، وغیرهم، ومن الاقوال الشائعةأن قلم ابن حزم کسیف الحجاج کلاهما ماض حاد، وقد اعتذر فی بعض کتبه عن حدته بأنها کانت ترجع الی مرض کان یلازمه،

وہ ٹھوس چٹان کی طرح اپنے مدمقابل کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔ اور اپنے مدمقابل کی حیثیت اور رتبے کی پروا نہیں کرتے چاہے وہ بڑا ہو یا چھوٹا، لوگوں کی نظروں میں قابل تعظیم ہو یا نہ ہو جیسے امام اشعری، امام ابوحنیفہ، امام مالک وغیرہ۔ مشہور ہے کہ ان کا قلم حجاج کی تلوار کی طرح ہے۔ دونوں تیز دھار اور کاری وار کرنے والے ہیں۔ اپنی بعض کتابوں میں

ولذلک کان محسدا من فقهاء عصره من سنیین ، وشیعة ومعتزلة، یدسون له الدسائس عند الملوک حتی یبعد من القصور وربما کان هذا نعمة، لأنه أتاح له أن یتحفنا بتآلیفه العظیمة القیمة.

انھوں نے اپنے قلم کی تیزی اور کاٹ پر معذرت بھی کی ہے۔ اور اس کا سبب ایک مستقل بیماری بتایا ہے۔ اس لیے اہلِ سنت، شیعہ، معتزلہ اور دیگر مسالک سے تعلق رکھنے والے فقہاء ہمیشہ ان کو زک پہنچانے پر آمادہ رہتے تھے۔ اور ان کے خلاف بادشاہوں کے کان بھرتے رہتے تھے۔ بعض اوقات انھیں محلات سے دور ہونا پڑتا لیکن یہ آزمائش بھی ان کے حق میں نعمت ثابت ہوئی کیوں کہ جس کثرت کے ساتھ ان کی قیمتی تالیفات ہمارے پاس موجود ہیں، یہ اسی ابتلاء اور آزمائش کا نتیجہ ہیں۔

ابن حزمؒ کے فقہی اصول

ابن حزمؒ کے مذہب کی بنیاد قرآن وسنت پر ہے۔ وہ قرآن وسنت کے بعد شرعی احکام کے استنباط کے لیے عقل کو حجت نہیں سمجھتے۔ وہ اجتہاد، قیاس اور دیگر مصادر کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک شرعی دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

کتاب اللہ جو کہ شریعت اسلامیہ کی اصل اول ہے جو بذات خود واضح اور بین ہے۔ اس کے بعد سارے احکام کو سمجھنے کے لیے کسی شارح اور ترجمان کی ضرورت نہیں، جیسے عقائد، نکاح اور میراث وغیرہ کے مسائل۔ قرآن مجید کے بعض احکام ایسے ہیں جو مجمل ہیں، جن کی تفصیل سنت سے معلوم ہوتی ہے۔ سنت رسول اللہ دوسرا مصدر ہے۔ ابن حزمؒ اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ وحی قرار دیتے ہیں اگرچہ نظم وتالیف تلاوت اور اعجاز میں وہ قرآن کریم کے مساوی نہیں۔ لیکن سنت کے ذریعے بہت سارے احکام کا علم حاصل ہوتا ہے جو کہ قرآن مجید میں مذکور ہیں۔

سنت کی دو بڑی قسمیں ہیں: متواتر اور آحاد

سنت متواترہ کے حجت ہونے میں امت مسلمہ کا اجماع ہے۔

جب کہ آحاد کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔

آحاد وہ روایات ہیں جن کو ایک یا ایک سے زیادہ راوی روایت کریں لیکن، اس کے اندر متواتر کی تمام شرائط نہ پائی جائیں۔ ابن حزمؒ عقائد کے باب میں بھی اخبار آحاد پر عمل کرنے کو واجب قرار دیتے ہیں۔ اس نقطہ نظر کی وجہ سے وہ دیگر علماء سے منفرد نظر آتے ہیں۔

ابن حزمؒ سے پہلے ظاہری مذہب، اس کے بانی داؤد ظاہری کے زمانے میں متداول ہو چکا تھا، لیکن ابن حزم نے اسے بہت زیادہ پھیلایا۔ ابو زہرہ اس مذہب کی اشاعت کے دو اسباب بیان کرتے ہیں:

۱۔ ابن حزم کی تالیفات نے اس مذہب کی اشاعت میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے اس مذہب کے اصول اور قواعد کو مرتب کیا اور دیگر مذاہب کے ساتھ تقابل کر کے اپنے موقف کو مدلل انداز میں پیش کیا۔ اس سلسلے میں ان کی "المُحَلّٰی" اور "الإحکام لأصول الأحکام" قابل ذکر ہیں۔

۲۔ ابن حزم نے محض تصنیف وتالیف سے کام نہیں لیا، بلکہ اپنے مذہب کی اشاعت کے سلسلے میں بھرپور جدوجہد کی۔ نوجوان طبقے نے خصوصاً اس مذہب کے اندر بڑی کشش محسوس کی اور انھوں نے اس کی اشاعت کے لیے بھرپور کوشش کی۔

دیگر فقہی مذاہب

ان دو بڑے مذاہب کے علاوہ اندلس میں دیگر مذاہب کے پیروکار بھی پائے جاتے تھے، لیکن وہ انتہائی قلیل تعداد میں تھے۔

اندلس میں قاسم بن سیار[۱۰] نے شافعی مذہب کو متعارف کروایا۔ قاسم بن سیار قرطبہ کے رہنے والے تھے۔ تیسری صدی ہجری کے وسط میں انھوں نے بلاد مشرق کی طرف سفر کیا اور شافعی مذہب کے بڑے بڑے شیوخ سے استفادہ کیا۔ اندلس واپس آ کر فقہاء کی مقلدانہ روش پر گرفت کی۔ انھوں نے درس وتدریس کے ذریعے شافعی مذہب کو پھیلانا شروع کیا۔ انھوں نے مالکی فقہاء کے برعکس فقہی اصولوں کا مطالعہ کیا اور قرآن و

سنت، اجماع اور قیاس سے مسائل کے لیے دلائل تلاش کیے۔

شافعی مذہب کے بڑے بڑے شیوخ میں بقی بن مخلد (م ۲۷۶ھ) ہارون بن نصر الا (جو کہ ابوالخیار کی کنیت سے معروف ہیں) اور یحییٰ بن عبدالفرید (جو کہ ابن الخزار کی کنیت سے معروف ہیں) شامل ہیں۔

اندلس میں ترویجِ فقہ کے مراحل

اندلس میں فقہ کی ترویج اور اشاعت کو دو مرحلوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

پہلا مرحلہ یا پہلا دور تقلیدِ محض کا ہے جس میں اندلس کے علماء نے فقہ مالکی کو اپنے پیشِ نظر رکھا اور اپنی تحقیق اور مجتہدانہ صلاحیتوں کو فقہ مالکی کے اصولوں کے ماتحت رکھا۔ فروعی مسائل کے اندر غور وخوض کرتے رہے لیکن اصول وضوابط میں امام مالکؒ کے مذہب سے روگردانی نہیں کی۔ امام مالک کی فقہ کی اشاعت کے لیے اندلس کے بڑے بڑے علماء اور فقہاء نے اپنی زندگیاں صرف کر دیں۔ ان کی دین داری، علمی لیاقت اور امراء کی سرپرستی نے فقہ مالکی کی اشاعت کے اسباب مہیا کر دیے۔

اس مرحلے میں موطا کی تعلیقات، شروح اور حواشی کثرت سے لکھے گئے۔ عالم اسلام میں سب سے زیادہ موطا پر تحقیقی کام علماء اندلس نے کیا۔ فقہی تالیفات میں عبدالملک بن حبیب کی ''الواضحۃ'' اور ابوالولید الباجی کی المنتقیٰ قابل ذکر ہیں۔

فقہ کے ارتقاء کا دوسرا دور تقابلی مطالعہ ہے۔ اس دور میں تقلید کی روش کو چھوڑ کر دیگر مسالک اور مذاہب کا تقابلی مطالعہ کیا گیا۔ ان کے اصول وضوابط کو پرکھا گیا اور ان کے دلائل پر بحث کی گئی۔ اس مرحلے میں قاضی ابوالولید بن رشد کا فقہی کام قابل ذکر ہے جو انھوں نے گراں قدر تالیف "بداية المجتهد ونهاية المقتصد" کی صورت میں انجام دیا۔

اس کے علاوہ اسی اسلوب پر ابن حزم نے اپنی کتاب ''المحلی'' تالیف کی۔ جس میں دیگر مذاہب کے اقوال اور دلائل پر بحث کی اور اپنا موقف بیان کیا اور دلائل کی تحلیل اور تجزیے کے بعد قوی اور راجح مسلک بیان کیا۔

حواشی ومراجع:

۱۔ ابن خلکان، وفیات الاعیان، ۳/ ۱۲۷، دار صادر، بیروت، ۱۳۹۷ھ

۲۔ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ۱۰/ ۱۳۳

۳۔ ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ۱/ ۴۸، دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدر آباد

۴۔ ابن القوطیہ کی نسبت سارۃ بنت المنذر کی طرف ہے یہ خاتون قوطی (Gothic) تھی اور شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ ابن القوطیہ نحو، لغت اور حدیث کے ماہر تھے۔ ان کی مشہور کتاب "تاریخ فتح الاندلس" ہے۔ اس کے علاوہ "تصاریف الافعال" مشہور کتاب ہے۔ ۳۶۷ھ میں وفات پائی۔

۵۔ ابن القوطیہ، تاریخ فتح الاندلس، ص ۲۳، المطبعۃ المحمودیۃ، القاہرۃ

۶۔ شکیب ارسلان، الحلل السندسیۃ ۱/ ۲۵۵، دار الکتاب العلمیۃ، بیروت، الطبعۃ الاولیٰ، ۱۴۱۷ھ

۷۔ ابن الفرضی، تاریخ علماء اندلس، ۲/ ۱۴۴، مطابع سجل العرب، القاہرہ، ۱۹۶۶ء

۸۔ احمد امین، ظہر الاسلام ۳/ ۵۶، مکتبۃ النہضۃ المصریۃ، قاہرۃ، ۱۹۹۲ء

۹۔ ایضا ۳/ ۵۸-۵۹

۱۰۔ قاسم بن محمد سیار کی کنیت ابو محمد تھی، یہ ولید بن عبد الملک کے آزاد کردہ غلام (مولیٰ) تھے۔ صاحب الوثائق کے لقب سے مشہور ہیں انھوں نے یحییٰ بن ابراہیم بن مزین اور عبد اللہ بن خالد کے نظریات کی تردید میں ایک کتاب لکھی۔ جس سے ان کی علمی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ۲۷۷ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے حالات زندگی کے لیے دیکھیے۔ تاریخ العلماء ۱/ ۸-۳۵۶

۱۱۔ ہارون بن نصر، قرطبہ کے رہنے والے تھے۔ بقی بن مخلد کے ساتھ چودہ سال رہے اور ان سے کثرت سے روایت کی۔ ابن الفرضی ان کے بارے میں لکھتے ہیں: لیس یدری احد من ھذا البلد مایقول ھذا یعنی : الفقہ (اس شہر میں ان سے بڑا فقیہ اور کوئی نہیں)۔ تاریخ العلماء ۲/ ۱۶۷-۱۶۶

☆

ماپلا مسلمانوں میں تعلیمی تحریک کا ارتقاء
(مالابار میں تعلیمی اداروں کا تاریخی تجزیہ)

——— ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی

مالابار کے مسلمان ماپلا کہلاتے ہیں۔ ماپلا کے کئی معانی ہیں مگر معروف معنی یہ ہیں کہ ماپلا دولھا کو کہتے ہیں۔ ان مسلمانوں نے یہاں آ کر شادیاں کیں لہذا ماپلا کہلائے، مگر جنوبی کیرالا میں کرسچین ماپلا بھی موجود ہیں۔ موجودہ دور میں ماپلا مسلمانوں کا شمار پچھڑی ذاتوں میں ہوتا ہے اور حکومت کی طرف سے ان کو رعایتیں بھی ملی ہوئی ہیں۔

مالابار کے علاقہ میں مسلمانوں کی تاریخ وتہذیب اپنے امتیازات وخصائص کے باعث معروف ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ شمالی ہند کے مسلمانوں نے اپنی فکری عظمت کے دھارے ایران وترکستان سے ملائے ہیں اور ان کے تہذیبی رجحانات سے اپنی تہذیب کی آبیاری کی ہے، مگر مالابار کا اسلامی کلچر خالص عرب تہذیب وتمدن سے متاثر ہے اور عربی کے اثرات ان کی زبان، تہذیب وتمدن اور ثقافت میں روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ عربی و اسلامیات کی تعلیم یہاں عام ہے۔ یہ خصوصیت صرف مالابار کی ہے کہ طالب علم پرائمری اسکول میں پہلی کلاس سے عربی زبان کی تعلیم حاصل کرتا ہے اور پورے دس برس ہر مسلم طالب علم عربی پڑھتا ہے۔ یہاں مالابار میں مسلمانوں کی اسلامی تعلیم کا ایک تاریخی جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

قدامت پسند علماء جدید تعلیم کے مخالف تھے یہ مخالفت درحقیقت حکومت برطانیہ سے نفرت، انگریزوں کی دشمنی اور جدید تعلیم یافتہ افراد کی بے دینی کے باعث تھی۔ خود شمالی ہند میں جو تحریک مقاطعہ علماء نے چلائی اور سرسید نے مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف راغب

کیا، بالکل یہی کیفیت ملک کے جنوب مغرب میں بھی پیدا ہوئی۔ مالابار کے علماء نے جدید تعلیم کا مقاطعہ کیا، صرف مدرسہ کی تعلیم اور قرآن کی تعلیم کی اجازت دی، باقی مسلمانوں کو جدید سرکاری اسکولوں میں بچوں کو بھیجنے سے قطعی طور پر منع کر دیا۔ مولوی صاحب سبق پڑھتے اور لڑکے اس کو دھراتے۔ جن مسجدوں میں درس رائج تھا اور آج بھی رائج ہے اس میں دراصل درس نظامی کی تعلیم ہوتی ہے۔ درس نظامی باوجود اپنی کوتاہیوں کے منطق وفلسفہ اور عربی زبان کی حقیقی استعداد پیدا کرنے میں مددگار ہوتا ہے۔ کتنے جوہر قابل اس درس کو پڑھ کر کارزار حیات میں آئے اور علم وفضل کے جوہر لٹائے۔ درس کا طریقہ جو مساجد میں رائج ہے باوجود کوتاہیوں کے طلبہ کے اندر استعداد پیدا کر دیتا ہے۔ آج بھی شوافع علماء اور مصلیان، درس کے ذریعہ مساجد میں بڑی تعداد میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ جدید تعلیم کے مقاطعہ کے باعث مسلمان پس ماندہ رہ گئے۔ ان قدامت پسند علماء نے انگریزی کو جہنم کی زبان اور ملیالم کو ہندوؤں کی زبان قرار دیا۔ برطانوی حکومت نے سوچا کہ اگر مایلا لوگوں کو جدید تعلیم دی جائے تو ان کے اندر جو بغاوت کا جذبہ ہے وہ شاید کم ہو جائے۔ ملایالم اور حساب کو مذہبی تعلیم کے ساتھ نصاب میں شامل کیا گیا۔ مولوی صاحبان کو اور خود طالب علموں کو بھی سرکاری امداد دی گئی۔ ہر پاس ہونے والے طالب علم کے لیے وظیفہ مقرر کیا گیا۔ محمڈن انسپکٹرس مقرر کیے گئے۔ ۱۸۸۶ء سے صوبائی حکومت نے ان گرانٹس کو تقسیم کرنا شروع کیا اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے ذریعہ یہ کام کیا گیا کہ کم از کم دس ہزار روپے عطا کیے گئے۔ اس اسکیم کو کچھ کامیابی ضرور ہوئی۔ ۱۸۹۴ء میں اراناڈ (Aranad) اور وللوناڈ (Valvannad) کے مایلا پس ماندہ قوموں میں شامل کر لیے گئے اور وہ اسپیشل گرانٹس کے مستحق ہو گئے۔ مایلا طلبہ کے لیے خاص طور سے اسکول کھولے گئے۔ پرائیوٹ بھی اور سرکاری بھی۔ ۱۹۲۶ء میں ایجوکیشن آفیسر خاص طور سے مایلا طلبہ کے لیے مقرر ہوا اور ۱۹۲۹ء میں مُلّا ڈپٹی انسپکٹر مقرر کیے گئے۔ انھوں نے اراناڈ اور پنّانی (Punnani) میں کام شروع کیا۔

۱۹۲۱ء کی بغاوت کے بعد مایلا کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی جس نے مذہبی تعلیم

کے لیے ریڈریں تیار کیں۔ پرائیوٹ لکھنے والوں کی بھی حوصلہ افزائی کی گئی۔ الغرض جبری پرائمری اسکول کی تعلیم کا رواج ڈالا گیا۔ کالی کٹ، ٹلیچری (Tellichery) اور کوچین کی میونسپلٹیوں میں اراناڈ اور پنانی میں بھی جبری تعلیم کا کا نفاذ ہوا۔ اسکول کے لیے بڑی تعداد میں اساتذہ درکار تھے۔ ۱۹۳۶ء میں مُلا پورم (Malappuram) میں مسلم ہائی اسکول گورنمنٹ نے قائم کیا۔ ۱۹۴۰ء میں حکومت نے تحصیل تیرور (Tirur) میں ایک مسلم ہائی اسکول لڑکیوں کے لیے شروع کیا۔ اس طرح ماپلا تعلیم کا آغاز ہوا۔ وہ ترقی کی راہ طے کرتی رہی۔ اگر چہ ترقی کی رفتار دھیمی تھی۔ مندرجہ ذیل نقشہ سے اس امر کی وضاحت ہوگی۔

سال	ادارہ کا نام	اسکولوں کی تعداد		طلبہ کی تعداد		کل طلبہ
		لڑکے	لڑکیاں	لڑکے	لڑکیاں	
۱۹۰۸ء	-	-	-	-	-	۱۶۰۰۰
۱۹۲۱ء	آرٹس کالج	-	-	۵۳۴	۷	۵۴۱
۱۹۲۱ء	ٹیکنیکل کالج	-	-	-	-	-
۱۹۲۱ء	سیکنڈری کالج	-	-	۵۹۲۷	۷۲۱	۶۶۴۸
۱۹۲۱ء	پرائمری اسکول	۲۶۹۱	۳۲۱	۱۶۳۷۲۳	۵۶۱۶۸	۲۱۹۸۹۱
۱۹۳۱ء	آرٹس کالج	-	-	۶۶۹	۲۸	۶۹۷
	ٹیکنیکل کالج		-	-	-	-
۱۹۳۱ء	سیکنڈری اسکول	۵۰		۱۰۰۱۵	۱۲۴۶	۱۱۲۶۱
۱۹۳۱ء	پرائمری اسکول	۳۴۲۱	۷۰۳	۲۱۲۶۲۶	۷۹۳۸۳	۲۹۲۰۰۹

حکومت نے کینانور میں ۱۹۳۱ء میں ماپلا اساتذہ کی ٹریننگ کے لیے ایک ایسا اسکول کھولا جس میں مذہب کی تعلیم اور ٹریننگ دی جاتی تھی۔

معونۃ الاسلام سبھا

معونۃ الاسلام سبھا کا قیام ۱۹۰۰ء میں پُنّانی میں ہوا۔ پی، ایم، پوکویا تھنگل

(Pukkoya Tangal) نے ۸/ستمبر ۱۹۰۰ء کو ایک ہزار نمائندوں کو بلایا جو مالابار کے مختلف علاقوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ ان سب نے مل کر طے کیا کہ ایک سبھا پنانی میں قائم کی جائے۔ ۱۹۰۸ء میں کمیٹی ایکٹ کے تحت یہ سبھا رجسٹرڈ کرائی گئی۔ خاص مقصد اس مجلس کا نئے اسلام قبول کرنے والوں کی تعلیم و تربیت ہے۔ ۳۰ سے ایک ہزار تک ہر سال غیر مسلم یہاں اسلام قبول کرتے ہیں۔ انھیں دو ماہ قیام، طعام اور لباس مفت فراہم کیے جاتے ہیں۔ اگر قرآن مجید کوئی پڑھنا چاہتا ہے تو یہ سہولت ۶ ماہ تک دی جاتی ہے۔ اس سبھا کا اصل کام ہائی اسکول تک عربی زبان کے ایک تعلیمی ادارہ کا قیام ہے۔

اس سبھا نے ایک یتیم خانہ، کئی اسکول، بنکاری کا اسکول اور عربی دار العلوم کھولا ہے۔ جب کہ اس کی شاخیں پورے کیرالا میں ہیں جو مذہبی مسائل میں استفتاء اور افتاء کا کام کرتی ہیں۔ فنڈ کے لیے اس کے پاس اوقاف ہیں۔ چندہ بھی لیا جاتا ہے۔ ۱۹۳۲ء میں معونۃ الاسلام سبھا نے ایک پرائمری اسکول کھولا جسے ۱۹۴۸ء میں ہائی اسکول بنا دیا گیا۔ اس میں ہندو مسلم سب طالب علم پڑھتے ہیں۔ ۱۹۵۲ء میں ۲۲۸ طلبہ تھے، جن میں ۸۱ غیر مسلم اور ۱۱ ہریجن تھے۔ ۱۹۸۳ء میں طلبہ کی تعداد ۱۲۰۰ ہوگئی جن میں ۵۰ فی صد طلبہ غیر مسلم تھے۔

حمایت الاسلام سبھا

حمایت الاسلام سبھا ۱۸۹۱ء میں کالی کٹ میں شروع ہوئی۔ اس کے مؤسس خان بہادر مٹو کایا تھنگل (Muttu Koya tangal) ہیں۔ اس سبھا کا خاص مقصد ماپلا مسلمانوں میں تعلیم کا فروغ تھا۔ ۱۹۰۸ء میں اس نے ایک کمیٹی ممتاز مسلمان زُعماء کی قائم کی ہے، تاکہ وہ کالی کٹ میں ایک اسکول قائم کرے۔ حمایت الاسلام پرائمری اسکول ۱۹۱۲ء میں قائم کیا گیا۔ ابتدا میں ۱۲ طلبہ تھے۔ پھر ۱۹۱۹ء میں مڈل اسکول بنا، ۱۹۲۲ء میں ہائی اسکول بنا دیا گیا۔ پی پی ایچی صاحب نے ۱۰ ہزار روپے عطا کیے اور اسکول کی دو منزلہ بلڈنگ کھڑی ہوگئی۔ اسکول چندہ سے چلایا گیا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں لڑکیوں کو بھی اسکول میں داخلہ ملنے لگا۔ ۱۹۲۷ء میں طلبہ کی تعداد ۶۰۰ ہوگئی۔

حمایت الاسلام ہائی اسکول میں مذہبی تعلیم بھی دی جاتی تھی اور قریب کی مسجد میں طلبہ کو نماز کی سہولت بھی میسر تھی۔ ۱۹۲۱ء کی بغاوت کے باعث بہت سے یتامیٰ اس میں داخل ہوئے۔ تعلیم مفت تھی۔ عربی زبان تمام مسلمان بچوں کو پڑھائی جاتی تھی اور اب بھی پڑھائی جاتی ہے۔

انصار الاسلام فی تعلیم الانام

(The Mohammadon Education Association)

۱۹۱۸ء میں ایک تعلیمی سوسائٹی 'انصار الاسلام فی تعلیم الانام' کے نام سے کالی کٹ میں رجسٹرڈ کرائی گئی۔ اس سوسائٹی کے مقاصد تین تھے۔

۱۔ مسلمان نوجوانوں کو مذہبی اور انگریزی دونوں طرز تعلیم سے آراستہ کیا جائے۔

۲۔ عربی، انگریزی اور اردو تینوں زبانیں پڑھائی جائیں۔

۳۔ کالی کٹ میں ایک ہائی اسکول بنایا جائے ''المدرسۃ المحمدیہ''

اُن مقاصد کے تحت ایک ہائی اسکول کے کے کنج احمد کویا حاجی، کے محمد کٹی حاجی اور وی علی برامی نے مل کر ایک لاکھ روپے ۱۹۱۸ء میں عطا کیے۔ ۱۵/اکتوبر ۱۹۱۸ء کو جسٹس عبدالرحمٰن آف مدراس ہائی کورٹ نے کالی کٹ تشریف لاکر مدرسہ کا افتتاح کیا اور اتنی مؤثر صدارتی تقریر کی کہ ۳۰ ہزار روپے لوگوں نے جلسۂ افتتاح میں ہدیہ کے طور پر اسکول کی نذر کیے۔ دو اساتذہ اور ۹ لڑکوں سے مدرسۂ محمدیہ شروع ہوا۔ غریب مسلمان اپنے بچے اسکول نہیں بھیجتے تھے۔ علماء کا قدامت پسند طبقہ بھی مخالفت کر رہا تھا۔ بہرحال اس اسکول میں دس برس بعد طلبہ کی تعداد ۴۳۰ ہوگئی اور ۱۷ اساتذہ کام کرنے لگے۔ ۱۹۴۴ء سے لڑکیوں کو بھی اسکول میں داخلہ دیا گیا۔

اس اسکول کی اہمیت یہ ہے کہ اس دور میں ''ماپلا'' اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم کی طرف نہیں بھیجتے تھے۔ اس مقاطعہ کے باعث ماپلا جماعت میں جہالت تھی، اس اسکول کے فیض سے ماپلا میں تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ پیدا ہوا۔

جمعیۃ الدعوۃ وتبلیغ الاسلام (J. D. T. Islam Sabha)

جے۔ڈی۔ٹی۔اسلام سبھا ۱۹۲۱ء میں قائم کی گئی۔اس کے قیام کا خاص مقصد یہ تھا کہ وہ یتامیٰ جو بڑی تعداد میں ماپلا بغاوت میں اپنے سرپرستوں کے شہید ہو جانے کے باعث پریشان حال تھے ان کی تعلیم وتربیت کا انتظام کیا جائے۔اس سبھا نے پہلے شہداء کی اولاد کی دیکھ بھال کی۔ان کے لیے کھانے پینے اور دوسری ضروریات مہیا کیں، پھر ان کے بچوں کو جمع کر کے ایک نیا یتیم خانہ جمعیۃ الدعوۃ وتبلیغ الاسلام کے نام سے قائم کیا۔یہ عظیم کارنامہ پنجاب کے قصوری خاندان کا ہے۔مولانا محی الدین احمد قصوری، مولانا عبدالقادر قصوری اور مولانا محمد علی نے یہ یتیم خانہ قائم کیا۔۱۹۲۱ء کے یتامیٰ کی یہ پناہ گاہ بن گیا۔ ۱۹۲۴ء کے سیلاب کے بعد یہاں یتامیٰ بڑی تعداد میں داخل ہوئے۔ پھر ۱۹۳۴ء میں کالرائے اور ۱۹۵۱ء میں چیچک نے بہت سے بچوں کو یتیم بنا دیا تھا وہ سب یہاں آئے۔اس میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں کو داخلہ دیا جاتا ہے۔اس یتیم خانہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مقیم طلبہ کو ٹیکنیکل تعلیم دی جاتی ہے ان کو مختلف پیشے سکھائے جاتے ہیں، تاکہ وہ اپنی روزی کما سکیں۔اس میں ایک ہائی اسکول ہے۔اس میں ہندو مسلم اور عیسائی سب کو داخل کیا جاتا ہے، مگر مسلمان زیادہ ہیں۔جو ادارے اس اسلام سبھا سے ملحق ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ یتیم خانہ: اس میں ۱۲۸۲ طلبہ اور طالبات ہیں جو یتامیٰ ہیں۔اردو ہندی اور عربی تعلیم بھی ان کو دی جاتی ہے۔

۲۔ پرائمری اسکول میں ۶۲۵ طلبہ ہیں اور ہائی اسکول میں ۱۶۵۰۔

۳۔ انڈسٹریل ٹریننگ سینٹر: نو (۹) پیشوں میں یہ سینٹر تعلیم دیتا ہے اور حکومت سے تسلیم شدہ (Registered) ہے۔

۴۔ ٹیکنیکل اسکول: اس میں کمپوزنگ اور پرنٹنگ کی تعلیم ہوتی ہے۔فنِ طباعت و پریس کا کام سکھایا جاتا ہے۔

۵۔ کرافٹ ٹریننگ: اس میں ولڈنگ (Welding) لوہاری، زراعت، ڈیری اور دوسرے پیشے سکھائے جاتے ہیں۔

۶۔ انڈسٹری: بنکاری، نجکاری اور دوسرے فنون سکھائے جاتے ہیں۔

اسلام سبھا ایک عربک کالج بھی چلاتا ہے جس میں اسلام کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے پاس ایک عمدہ لائبریری بھی ہے۔ مرکزی حکومت اور کیرالا حکومت سے اس کو گرانٹ ملتی ہے۔ اس نے اب تک ۱۰ ہزار یتامیٰ کو تعلیم دی ہے اور میدان عمل میں بھیجا ہے۔ بہت سے طلبہ ڈاکٹر، انجینئر اور دوسرے عہدوں کے اہل بن گئے ہیں۔

کیرالا مسلم یکتا سنگم (Kerala Muslim Ekta Sangam)

کیرالا کے مسلمانوں میں جب تعلیم کا رواج نہ تھا، اس وقت یہ جماعت وجود میں آئی۔ ایکتا سنگم نے سب سے پہلے تو یہ کوشش کی کہ مسلمانوں میں آپس میں جو دو گروہ ہوگئے تھے ان میں صلح کرائے۔ اس سنگم کی بنیاد کوڈنگالور (Kodangalur) میں ۱۹۲۲ء میں پڑی۔ کوڈنگالور کی اہمیت یہ ہے کہ یہاں پہلے ایم بڑا راجا تھا جس کا یہ پایہ تخت رہ چکا ہے۔ یہاں کے مسلمان مالی طور پر اچھے حال میں تھے اور یہ علاقہ ریاست کوچین کا حصہ تھا۔ مگر مسلمان یہاں دو گروہوں میں منقسم تھے اور ان میں باہم رقابت تھی۔ اِن حالات میں چند صاحبِ غیرت و صاحبِ شعور مسلمانوں نے اری یاڈ (Eriyad) کے مقام پر ایک میٹنگ بلائی، تاکہ مسلمانوں میں صلح کرادیں، پھر اس کے بعد اصلاحِ امت کا کام انجام دیں۔ اس جلسہ میں کے، ایم، سیدتھی (K. M. Seethi) کے ایم، مولوی شریک ہوئے۔ یہ واقعہ ۱۹۲۲ء کا ہے۔ ۱۱ ممبروں پر مشتمل ایک جماعت کی تشکیل ہوئی۔ جلد ہی اس کی ممبر شپ بڑھ گئی اور اس کی شاخیں دوسرے علاقوں میں پھیل گئیں۔ پہلے اس جمعیت کا نام تھا ''غیر جانب دار سنگم'' (Nishpaksha Sangam) مگر آخر میں اس کا نام بدل کر کیرالا مسلم ایکتا سنگم رکھ دیا گیا۔ یہ پہلی جماعت ہے جو کیرالا کے پورے مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے بنائی گئی۔ اس جماعت کے مخالفین نے اسے بدنام کرنے کی تمام کوششیں

کرڈالیں، مگر وہ کامیاب نہ ہوئے۔ اس سنگم کی پہلی میٹنگ اری یاڈ (ERIYAD) میں ۱۹۲۳ء میں منعقد ہوئی، جس میں شرکاء بڑی تعداد میں دور دور سے آئے۔ اس جلسہ کی صدارت وے، کوم، عبدالقادر مولوی نے کی۔ اس اجلاس میں اس زمین کے بارے میں بھی بحث ہوئی جو حکومت نے مسلمانوں کو عربک کالج بنانے کے لیے دی تھی۔ گورنمنٹ آف ٹراونکور نے ۷/۱ ایکڑ زمین دی تھی، اس شرط پر کہ ۱۰ ہزار روپیہ ڈیپازٹ کیے جائیں۔ سنگم نے رقم جمع کر کے گورنمنٹ کو دے دی، مگر بہر حال کالج نہ بن سکا۔

اس کانفرنس میں بدعات اور غلط رسوم کے خلاف بھی تجویزیں پاس ہوئیں جس کی وجہ سے اہلِ بدعت اس کے مخالف بن گئے۔ پھر بھی جو جذبۂ اصلاح ان اہلِ حق کے دلوں میں موجود تھا اس کے باعث یہ لوگ آگے بڑھے، انھوں نے ٹراونکور (Travancor) اور کوچین میں اس سنگم کی شاخیں کھولیں۔ انھوں نے دو رسالے جاری کیے۔ مسلم ایکیم (Muslim Aikyam) ملایالم میں اور 'الارشاد' عربی میں۔ دوسری کانفرنس اس سنگم کی الوائی (Alwai) میں ۱۹۲۴ء میں منعقد ہوئی۔ جس کا مقصد دقیانوسی علماء کی اس جمعیت کے متعلق غلط فہمی دور کرنا تھا۔ اس کانفرنس کی صدارت باقیات الصالحات کے پرنسپل مولانا عبدالجبار نے فرمائی۔ مسلم ایکتا سنگم کی تیسری کانفرنس کالی کٹ میں ۱۹۲۵ء میں منعقد ہوئی۔ اس کی صدارت خان بہادر محمد شمناڈ (Shamnad) نے کی۔ یہاں یہ دل چسپ واقعہ پیش آیا کہ جو علماء مخالفت کے لیے آئے تھے وہ بحث ومباحثہ کے بعد اس سنگم کے موافق بن گئے اور اس کے قائل ہو گئے۔ اس سنگم کی چوتھی کانفرنس ٹلیچری میں ۱۹۲۵ء میں منعقد ہوئی جس کی صدارت محمد مارما ڈیوک پکتھال (Mohd. Mormaduke Pikthal) نے کی۔ اس کانفرنس میں مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق غور خوض کیا گیا اور کئی تجاویز پاس کی گئیں۔ پانچویں کانفرنس کینانور میں ۱۹۲۷ء میں منعقد ہوئی۔ اس کی صدارت پنجاب کے مشہور قصوری خاندان کے مولانا محمد علی قصوری نے فرمائی۔ اسی خاندان نے مشہور یتیم خانہ ۱۹۲۱ء کی بغاوت کے بعد قائم کیا، تاکہ مسلم یتامیٰ کی تعلیم وتربیت ہو سکے۔ چھٹی کانفرنس ڈاکٹر عبدالحق کے زیر صدارت منعقد ہوئی۔ ۱۹۲۸ء میں ڈاکٹر صاحب مدراس پبلک سروس

کمیشن کے ممبر تھے۔ ساتویں کانفرنس ۱۹۲۹ء میں ارناکولم (Arnakulam) میں منعقد ہوئی۔ آٹھویں کانفرنس ٹریونڈرم (Trivandrum) میں ۱۹۳۰ء میں ہوئی۔ نواں اجلاس ملاپورم میں ۱۹۳۱ء میں منعقد ہوا۔ دسواں اجلاس کاسرگوڑ (kasargod) میں ۱۹۳۲ء میں ہوا۔ گیارہواں اجلاس اری یاڈ میں ۱۹۳۳ء میں منعقد ہوا۔ ان مجالس کا اصل نفع یہ پہونچا کہ مسلمانوں کو جمع کرنے اور ان کے اجتماعی اور تعلیمی مسائل پر غور کرنے کے لیے اس سنگم نے ایک پلیٹ فارم مہیا کر دیا۔ اس نے دقیانوسی علما اور ان کے جاہل حامیوں کی پروا کیے بغیر جدید تعلیم کے لیے کوشش کی۔ عربی مدرسے بھی کھولے اور جدید کالج بھی۔ اس سنگم نے اپنے بارہویں اجلاس میں اپنی جائدادیں فاروق کالج کالی کٹ کو عطا کر دیں اور بدعات سے مسلمانوں کو منع کیا۔

تری رنگاڑی یتیم خانہ

۱۹۴۳ء میں مالابار کے علاقہ میں کالرا پھیلا اور ہزاروں انسان اس کا شکار ہو گئے۔ چوں کہ یہ علاقہ مسلم آبادی کا ہے۔ لہٰذا مسلمان یتیم لڑکے اور لڑکیاں کثرت سے نظر آنے لگے۔ ان کی تعلیم و تربیت کے لیے اے، کے مولوی، ایم کے حاجی اور کے ایم مولوی نے مشورہ کر کے ایک یتیم خانہ تری رنگاڑی (Trirangadi) میں کھولا۔ اس کا افتتاح ۱۱ر دسمبر ۱۹۴۳ء کو ہوا۔ اس میں ۱۱۴ طلبہ کو داخل کیا گیا جو یتیم تھے۔ اس کا الحاق جے ڈی ٹی، اسلام سبھا سے کر دیا گیا، مگر بعد میں یہ تعلق ختم ہو گیا اور یتیم خانہ آزاد ادارہ کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔

یہ ادارہ جو بغیر کسی جائداد، وقف اور فنڈ کے شروع کیا گیا تھا وہ اس کے بانیوں کی نیت کے خلوص کی برکت سے دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا رہا، حتی کہ ۱۹۸۱ء میں یتامیٰ کی تعداد ۱۰۴۱ تک پہونچ گئی۔ جن میں ۶۶۳ لڑکے اور ۳۷۸ لڑکیاں تھیں۔ ۱۸ر اسٹاف ممبر ان کی دیکھ بھال میں مشغول ہیں۔ ان یتیموں کو مفت کھانا، کپڑا، علاج اور تعلیم فراہم کی جاتی ہے۔ سالانہ خرچ اس یتیم خانہ کا ۴ لاکھ ہے۔ کیرالا کے تعلیمی اور رفاہی اداروں میں

تری رنگاڑی یتیم خانہ کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔

یتیم خانہ کے بانیوں نے یہ طے کرلیا تھا کہ یتیموں کو جدید تعلیم دی جائے گی۔ انھوں نے سیکولر تعلیمی ادارے کھولے، مگر دینی تعلیم کا پورا انتظام الگ سے کیا۔ یہاں تک کہ ایک عربی کالج ان طلبہ کے لیے کھول دیا جو عربی پڑھنا اور اسلامیات میں تبحر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کی خاطر یتیم خانہ کے کیمپس میں مندرجہ ذیل تعلیمی ادارے یتیموں کے لیے کھولے گئے، مگر غیر یتامیٰ بھی ان میں داخلہ لیتے اور پڑھتے ہیں، حتی کہ غیر مسلم بھی ان میں آتے ہیں اور ان کے دروازے سب کے لیے کھلے ہیں۔

۱- مدرسۃ نور الاسلام

اس میں طلبہ کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ یہ حکومت سے تسلیم شدہ نہیں ہے۔ اسے محض طلبہ کی اسلامی تربیت کے لیے کھولا گیا ہے۔

۲- اورینٹل ہائی اسکول

۲۲ر جولائی ۱۹۵۵ء کو یہ ہائی اسکول کھولا گیا۔ عربی زبان اس میں سب کے لیے لازمی قرار دی گئی۔ جو طالب علم اس میں داخلہ لے گا اس کو عربی ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھنی پڑے گی۔ چوں کہ پورے دس برس طلبہ کو اس میں عربی پڑھائی جاتی ہے، اس بنا پر اس کی استعداد بہت پختہ ہو جاتی ہے۔ ۱۹۸۱ء تک اس میں طلبہ کی تعداد ۶۶۷ ہوگئی اور ۳۶ اساتذہ کام میں مشغول ہیں۔

۳- پوکر صاحب میموریل کالج

اسی کیمپس سے ملحق کالج کیمپس ہے جو دراصل انھیں یتیموں کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ اس میں آرٹس، سائنس، کامرس اور دوسرے مضامین کی تعلیم ہوتی ہے۔ غیر یتامیٰ کی کثرت ہے، مگر یتامیٰ کو اس میں داخلہ ملتا ہے اور ہزاروں یتیم استاذ، انجینئر اور ڈاکٹر بن کر زندگی کے مختلف میدانوں میں سرگرم عمل ہے۔ اس میں عربی کا شعبہ بھی ہے اور

اسلامی تاریخ کا شعبہ بھی علیٰحدہ کام کر رہا ہے۔ یہ ایک نیک نام اور عمدہ مسلم کالج ہے۔ اس کی اپنی خوبصورت بلڈنگ ہے۔

۴-عربک کالج

یتیم خانہ کے کیمپس میں ایک عربی کالج قائم ہے۔ اس میں جو طلبہ عربی پڑھنا چاہتے ہیں ان کو داخلہ دیا جاتا ہے، یہ تسلیم شدہ نہیں ہے۔ بلکہ عام مدارس کی طرح ایک مدرسہ ہے۔ اس میں طلبہ محدود تعداد میں داخل ہوتے ہیں اور اساتذہ بس ایک یا دو ہی ہیں۔ یہ کالج صرف یتامیٰ کے لیے ہے۔

انجمنِ روضۃ العلوم

ادارہ روضۃ العلوم (Association) نے کئی تعلیمی ادارے کھولے۔ یہ انجمن مولانا ابوالصباح نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے قائم کی تھی۔ اس نے کالی کٹ میں دریائے چالیار کے کنارے ایک وسیع وخوش نما قطعۂ آراضی خرید کر اس میں بہت سے تعلیمی ادارے ایک ہی کیمپس میں قائم کر دیے۔ انھوں نے یہ ادارے اس علاقہ میں بنائے جو فاروق (Feroke) کہلاتا ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ سلطان ٹیپو نے اپنا گورنر یہاں مقرر کیا تھا جس کا نام فاروق تھا۔ اس کی مناسبت سے وہ قلعہ اور پورا علاقہ فاروق کہلاتا ہے۔ قلعہ تو مسمار ہو گیا، مگر علاقہ کا نام آج فاروق ہے۔ اس تاریخی مناسبت سے اس آرٹس اور سائنس کالج کا نام بھی فاروق رکھا گیا جو انجمن روضۃ العلوم نے مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے قائم کیا۔

مولانا ابوالصباح نے الازہر یونیورسٹی مصر سے ڈگری حاصل کی اور لوٹ کر اپنے گاؤں انا کایم (Anakkayam) میں زندگی گزارنے لگے جو منجیری (Manjeri) کے قریب ہے۔ انھوں نے پہلے فقہ کی تعلیم کچھ منتخب طلبہ کو دینی شروع کی۔ ان کے تعلیم یافتہ چار طالب علم افضل العلماء مدراس یونیورسٹی کے امتحان میں بیٹھے۔ چاروں طالب علم ۱۹۴۴ء

کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ اب مولانا ابوالصباح نے اپنا ادارہ منیجری شہر میں منتقل کر دیا۔ مارچ ۱۹۴۵ء میں مدراس یونیورسٹی نے روضۃ العلوم کالج کو تسلیم کیا۔ یہ مالابار کا پہلا عربی کالج ہے جس کو مدراس یونیورسٹی نے تسلیم کیا ہے۔ مولانا ابوالصباح ازہری کالج کو کسی وسیع جگہ منتقل کرنا چاہتے تھے، چناں چہ حاجی عبدالقادر ساکن چاوَکاڈ (Chovakkad) نے کالج کی تعمیر کے لیے دس ہزار روپے عطا کیے۔ حاجی عبداللہ کٹی پلائل (Puliyal) نے ایک وسیع قطعۂ اراضی روضۃ العلوم عربک کالج کو عطا کر دیا اور یہ کالج اس میں منتقل ہو گیا۔

مولانا ابوالصباح ازہری نے یہ تجویز رکھی کہ اس کیمپس میں ایک علوم عصریہ کا کالج کھولا جائے۔ چناں چہ فاروق کالج کے نام سے اس کی بنیاد رکھی گئی اور ستمبر ۱۹۴۷ء میں مدراس یونیورسٹی کو اس کالج کے الحاق کے لیے درخواست دی گئی۔ مدراس یونیورسٹی نے جو کمیشن بھیجا اس نے عمدہ رپورٹ دی اور فاروق کالج فرسٹ گریڈ کالج کی حیثیت سے ۱۲/اگست ۱۹۴۸ء سے ظہور میں آ گیا۔ اس وقت ۴ طلبہ بی اے میں اور ۲۸ طلبہ انٹرمیڈیٹ میں تھے۔ جب کالج کی بلڈنگ تیار ہو گئی تو چنگم (Chungam) سے یہ کالج منتقل ہو کر اپنے اصل مستقر فاروق کیمپس پہنچ گیا۔ رفتہ رفتہ فاروق کالج نے بڑی ترقی کی۔ اس میں ایم اے اور ایم ایس سی کی تعلیم بھی شروع کر دی گئی۔ کالی کٹ یونیورسٹی سے ملحق کالجوں میں یہ ایک ممتاز اور بڑا کالج ہے جہاں عمدہ تعلیم کا انتظام ہے۔ کالج میں بہت سے ہوسٹل طلبہ کے لیے بنائے گئے۔ مگر لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ہوسٹل نہیں بنایا گیا۔ ۱۹۵۵ء سے لڑکیوں کو بھی اس کالج میں داخل کیا گیا۔ پہلے صرف ایک طالبہ داخل ہوئی، مگر ۱۹۶۳ء میں لڑکیوں کی تعداد ۲۲۷ ہو گئی۔ کالج کی ایک خصوصیت اس کی عمدہ لائبریری بھی ہے جس میں ہزاروں کتابیں موجود ہیں۔

اس کالج کی خوبی یہ ہے کہ پہلے شاندار راجا گیٹ ہے۔ پھر فاروق کالج کی سہ منزلہ شاندار بلڈنگ ہے۔ کئی بورڈنگ ہاؤس میں کھیل کا میدان ہے۔ اس کے بعد نشیبی حصہ میں پہلے مسجد ہے، پھر روضۃ العلوم عربک کالج کی عمارتیں ہیں۔

روضۃ العلوم عربک کالج سے ملحق فاروق ہائی اسکول اور اس کی عمارتیں ہیں۔ اس

کے بعد آخری حصہ میں فاروق یتیم خانہ اور اس کا عمدہ ہوسٹل ہے، جہاں یتامیٰ رہتے ہیں۔

فاروق کالج کے گیٹ سے ملحق ایک بڑی عمدہ عمارت ہے۔ یہ ہے فاروق ٹریننگ کالج۔ اس کالج کی اپنی تعلیمی عمارت اور اس کا ہوسٹل ہے۔ اس کا اپنا کیمپس ہے، اسی طرح فاروق کالج، روضۃ العلوم عربک کالج، فاروق ہائی اسکول، فاروق ٹریننگ کالج اور فاروق یتیم خانہ سب ہی کیمپس کے اندر ہیں اور ایک چھوٹی سی یونیورسٹی کا منظر پیش کرتے ہیں۔

فاروق کالج میں دو ہزار سے زائد طلبہ ہیں اور اکثریت مسلمان طلبہ کی ہے۔ لیکن اگر تمام اداروں کے طلبہ کا شمار کیا جائے تو تعداد کئی ہزار ہو جائے گی۔ فاروق کالج کا اپنا اسٹیڈیم ہے۔ وسیع کھیل کا میدان ہے۔ اساتذہ کے لیے کوارٹر ہیں۔ جتنے ادارے ہیں سب کے اپنے اپنے ہوسٹل ہیں۔ فاروق کالج کے تو بہت سے ہوسٹل ہیں۔ ان کے نام بھی مسلمان زعماء کے نام پر رکھے گئے ہیں جیسے اقبال ہوسٹل، سرسید ہوسٹل وغیرہ۔ فاروق کالج کا انڈور اسٹیڈیم بھی ہے۔ فاروق کالج کا انگلش میں ریسرچ سینٹر ہے جہاں پی ایچ ڈی کرنے کے لیے طلبہ داخل ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ کالج اس علاقہ میں مسلمانوں کی تعلیم میں ایک بنیادی رول ادا کر رہا ہے مگر اس کے دروازے غیر مسلموں کے لیے بھی کھلے ہیں۔

مذہب کا اسلامی تصور

(مولانا سلطان احمد اصلاحی)

اس کتاب میں معاملاتِ دنیا سے مذہب کی بے دخلی کے تصور کو اس کے خاص تاریخی تناظر میں دکھایا گیا ہے۔ کتاب کے پہلے باب میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ چرچ کے ناقابلِ بیان مظالم کے نتیجے میں یورپ میں چرچ اور اسٹیٹ کی علیحدگی اور مسیحیت سے بے زاری کے ساتھ خود مذہب سے بے زاری پیدا ہوگئی تھی۔ دوسرے باب میں قرآن اور سنت کی روشنی میں اسلام کے مطلوبہ تصورِ مذہب کو پورے شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

آفسیٹ کی عمدہ طباعت، صفحات: ۵۹۱ قیمت =/۱۰۰ روپے

ملنے کے پتے

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳ علی گڑھ-۱

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، دعوت نگر ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵

بحث ونظر

صفاتِ الٰہی کے بیان کا قرآنی اسلوب
اور انسانی زندگی پر ان کے اثرات

——— ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس

وجودِ باری تعالیٰ کے بارے میں انسانوں میں غلط فہمیاں بہت کم پیدا ہوئیں، البتہ صفاتِ الٰہیہ کا صحیح عرفان اور شعور نہ ہونے کی بنا پر لوگ زیادہ کج روی کا شکار ہوئے۔ اس لیے قرآن کریم نے متعدد مقامات پر صفات الٰہی کو بار بار مختلف اسلوب و پیرائے میں بیان کر کے ان کے سلسلہ میں انسانی ذہنوں میں پائی جانے والی کج فہمیوں کا ازالہ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خالق کائنات اور مخلوق کے مابین رشتہ وتعلق کی نوعیت صفات الٰہی ہی سے واضح ہوتی ہے اور ذات باری تعالیٰ کا عرفان بھی ان ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ صفات عظمت الٰہی کی اس بلندترین حقیقت کو آشکارا کرتی ہیں کہ انسان ذات الٰہی کی حقیقت تک پہنچنے میں کتنا عاجز و بے بس ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے اللہ تعالیٰ کو ''الاسمآء الحسنیٰ'' سے پکارنے کا حکم دیا (الاسراء:۱۱۰) اور ''الحاد فی الاسماء'' سے منع فرمایا (الاعراف:۱۸۰) کیونکہ یہ الحاد شرک یا کفر کی طرف لے جاتا ہے۔

''قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے صفات و افعال اور اس کے انعامات کا اتنی کثرت سے ذکر اور اس کا اعادہ وتکرار اس قدر شرح وبسط کے ساتھ بیان کا اصل راز یہی ہے اس لیے کہ صفات ہی محبت وشوق کا سرچشمہ ہیں، اسی بات کو بعض ائمہ اسلام نے ''نفی مجمل اور اثبات مفصل'' سے تعبیر کیا ہے، یہی اثبات ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات کریمہ کا بیان اور اس کے دلائل وشواہد کا ذکر) جس سے انسان کے ذوق وشوق کو غذا ملتی ہے اور محبت جوش مارنے لگتی ہے اگر نفی رہبر عقل ہے تو اثبات رہبرِ دل، اگر اللہ تعالیٰ کی یہ صفات عالیہ

اور اسماء حسنیٰ ہمارے سامنے نہ ہوتے، جن سے قرآن وحدیث بھرا ہوا ہے...تو یہ دین ایک چوبی یا آہنی نظام اور قانون کی طرح ہوجاتا جس کی دلوں میں کوئی جگہ نہ ہوتی، یہ نہ ان میں کوئی جذبہ اور گرم جوشی پیدا کرسکتا، نہ ان کے دلوں کو گرم اور آنکھوں کو نم کرنے کی صلاحیت رکھتا...اس کے بغیر خدا اور بندہ کا تعلق ایک مردہ اور محدود تعلق ہے جس میں نہ کوئی زندگی ہے، نہ روح، نہ لچک، نہ وسعت''۔[۱]

حدیث پاک میں نبی رحمت ﷺ کا صفات الٰہی والی احادیث کو یاد کرنے والے کے لیے جنت کی بشارت بھی درحقیقت انسان کو نہ صرف ان اسماء کے مفاہیم کی معرفت سے آشنا ہونے کا پیغام دیتی ہے بلکہ انسان کو ان صفات سے متصف ہونے کا درس بھی اس میں پنہاں ہے۔

اس حدیث کی طرف ان سطور میں اشارہ کیا گیا ہے:[۲]

یہ ننانوے نام تو اللہ تعالیٰ کی بے شمار صفات کے ابواب کے عنوانات ہیں۔ صفات الٰہی تو لامتناہی ہیں۔ ہر نیا دن اور ہر نئی تخلیق صفات الٰہیہ میں سے کسی صفت کا پرتو ہوتی ہے۔ انہی صفات میں سے ہر مخلوق اپنے ظرف کے مطابق فیض یاب ہوتی ہے۔[۳] پھر کائنات اور انسان کی ساری سرگرمیاں انہی صفات کا مظہر ہوتی ہیں۔ ان لامتناہی صفات کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

صفاتِ ثبوتیہ: وہ صفات جو باری تعالیٰ کے لیے ثابت ہیں اور اللہ تعالیٰ کی زیبائی اور جمال کی آئینہ دار ہیں جیسے علم، قدرت۔

صفاتِ سلبیہ: وہ صفات جن کی خدا سے نفی کی گئی ہے۔ جیسے جہل، عجز۔

صفاتِ فعل: وہ صفات جن کا تعلق افعال خدا سے ہے۔ جیسے خالق، رازق۔

قرآن کریم میں مختلف احکام کے تذکرہ کے بعد صفاتِ الٰہیہ کا بیان ہوا ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ احکامِ الٰہیہ کے ساتھ ان کا گہرا تعلق ہے۔ اس کا اندازہ اصمعی کے ساتھ پیش آنے والے اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک دن انھوں نے یہ آیت پڑھی: السارق والسارقة.....الخ لیکن غلطی سے واللہ غفور رحیم کہہ دیا۔ ایک اعرابی قریب تھا اس

نے پوچھا کہ یہ کس کا کلام ہے؟ اصمعی نے کہا اللہ کا۔ اس نے کہا کہ یہ اللہ کا کلام کیسے ہوسکتا ہے؟ اگر اللہ نے معاف کر دیا اور رحم کیا تو ہاتھ کاٹنے کا حکم کیوں دیا؟ یہ حکم تو اس لیے تھا کہ وہ قدرت وغلبہ کا مالک ہے۔[۴] گویا اعرابی نے صفات کے ذکر میں غلطی کا اندازہ ماقبل سے لگایا۔ اسی طرح ایلاء سے رجوع کرنے والوں کے لیے غفور اور رحیم کی صفات آئیں۔ قسم اٹھا کر عورت کو پریشان کیا اور قسم توڑ کر اللہ کے نام کی عزت کا پاس نہیں کیا۔ اس لیے کفارہ کا حکم دیا اور ساتھ ہی مغفرت اور رحمت کا امید افزا پیغام بھی دے دیا۔ ایسے لوگوں کے لیے انہی صفات کا مژدہ ہونا چاہیے تھا، مگر جو طلاق کا عزم کرلیں ان کے لیے صفات سمیع اور علیم آئیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس ساری گفتگو کو سنتا ہے جو وہ اس سلسلہ میں عوام الناس اور اعزاء واقربا سے کرتا ہے۔ وہ لوگوں سے جو چاہے کہے مگر اس عزم طلاق کے حقیقی محرکات سے خالق کائنات آگاہ ہے۔[۵]

قرآن کریم کی سورتوں اور آیات کے باہمی نظم وربط کو زمانۂ قدیم سے علماء و محققین نے اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔[۶] اس نظم کی اہمیت تو ہے ہی مگر سورتوں میں مختلف آیات کے اختتام پر آنے والے اسمائے الٰہیہ کا بھی ماقبل حکم ربی سے مناسبت اور تعلق ضرور ہے۔ یہ بھی اعجاز قرآن کا ایک پہلو ہے۔

آیات کے اختتام پر عموماً صفات الٰہیہ مرکب صورت (یعنی دو صفاتی ناموں کی صورت میں) آئی ہیں۔ صفاتی ناموں کے یہ جوڑے بھی کئی شکلوں میں ہیں۔ یقیناً ان میں بھی کوئی نظم وربط اور مناسبت ہوگی۔

یہاں چند ایسے اسماء کا اجمالی تذکرہ پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) عزیز:

اصل میں عزت کا معنی روکنا ہے۔ ارض عزاز اس زمین کو کہا جاتا ہے جو بہت سخت ہو۔[۷] حاشیۃ الصاوی علی الجلالین میں ہے:

"عزیز" لا یعجزہ شی عن انتقامه منکم ای لاتفتلون منه.[۸]

گناہوں کا انتقام لینے میں اسے کوئی عاجز نہیں کرسکتا اور نہ تم اپنے آپ کو اس سے چھڑا سکتے ہو۔

اسی وجہ سے 'عزیز' کا ترجمہ 'غالب' کیا جاتا ہے۔ امام رازی نے اس لفظ کو زیادہ جامع انداز میں بیان کیا ہے:

أن العزيز من لا يمنع عن مراده، وذلک انما يحصل بكمال القدرة، وقد ثبت انه سبحانه وتعالیٰ قادر على جميع الممكنات فكان عزيزا على الاطلاق۔ ۹

عزیز وہ ہے جسے کوئی بھی اس کے ارادے سے روک نہ سکے۔ یہ چیز کمال قدرت سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام ممکنات پر قادر ہے اس لیے وہ عزیز مطلق ہے۔

جمال الدین القاسمی 'العزیز' کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

هو الغالب بقدرته، المستعلي فوق عباده، يدبر امرهم بما يريد، فيقع في ذلک ما يشق عليهم ويثقل ويغم ويحزن، فلا يستطيع احد منهم رد تدبيره، والخروج من تحت قهره وتقديره۔ ۱۰

وہ اپنی قدرت سے غالب ہے اور اپنے بندوں پر مکمل تصرف رکھتا ہے ان کے معاملات کی جیسے چاہتا ہے تدبیر کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں بندوں پر مشقت اور بوجھ بھی آتا ہے اور وہ حزن وملال کے شکار بھی ہوتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی تدبیر رد کرنے اور اس کی تقدیر وقہر سے نکلنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔

ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

"العزيز" ذو العزة وهي القوة، والشدة، والغلبة والرفعة۔ ۱۱

عزیز یعنی عزت والا۔ عزت کے معنیٰ ہیں، قوت وطاقت، غلبہ ورفعت

یہ اسم مبارک درج ذیل جوڑوں کی شکل میں قرآن میں استعمال ہوا ہے۔

(الف) حکیم:

صفت 'عزیز' کے ساتھ سب سے زیادہ استعمال صفت 'حکیم' کا ہوا ہے۔ حکیم وہ

ہے جو چیز کو اچھے طریقہ پر ایجاد کرے، افضل اشیاء سے بہترین طریقہ پر آگاہ ہو اور غلط کام سے روکے۔[۱۲]

(ب) علیم[۱۳]

(ج) جبار: قوت وشدت سے اصلاح کرنے والے کو جبار کہتے ہیں۔[۱۴]

(د) مقتدر: قدرت تامہ وکاملہ کا مالک (قرآن کریم میں صفت عزیز کے ساتھ اس صفت کا ذکر سورۃ القمر:۴۲ میں آیا ہے۔

(ہ) غفار[۱۵]

(و) رحیم[۱۶]

(ز) قوی[۱۷]

(ح) حمید[۱۸]

یہ استعمالات ظاہر کرتے ہیں کہ وہ پروردگار جس کو اس کائنات پر کامل غلبہ، قوت واقتدار حاصل ہے وہ اس قوت وطاقت کو حکمت، علم اور رحم کے ساتھ استعمال کرتا ہے۔

یہاں عزیز اور حکیم کے قرآنی استعمالات اور انسانی زندگی پر اس کے اثرات کا جائزہ پیش خدمت ہے۔

(۱) رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ. (البقرۃ:۱۲۹)

اے ہمارے رب انھیں میں سے ایک برگزیدہ رسول بھیج تا کہ انھیں تیری آیات پڑھ کر سنائے اور انھیں کتاب اور دانائی کی باتیں سکھائے اور انھیں پاک صاف کردے بے شک تو ہی بہت زبردست (اور) حکمت والا ہے۔

یہاں ان دوصفتوں کا حوالہ دینے سے مقصود یہ ہے کہ جو خدا عزیز وحکیم ہے اس کی عزت وحکمت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنی پیدا کی ہوئی اس مملکت میں سفیر بھیجے جو اس کی رعیت کو اس کے احکام وقوانین سے آگاہ کرے اور ان کو شریعت اور حکمت کی تعلیم دے۔[۱۹]

(۲) فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَاجَاءَ تْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ. (البقرۃ: ۲۰۹)

اگر روشن دلیلیں آنے کے بعد بھی تم پھسلے لگو تو جان لو اللہ تعالیٰ زبردست (اور) حکمت والا ہے۔

عزیز کی صفت کے ذکر سے دو حقیقتوں کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ ایک یہ کہ خدا کوئی کم زور و ناتواں ہستی نہیں ہے، بلکہ وہ غالب و توانا ہے۔ جو لوگ اس کی تنبیہات کے باوجود شیطان کی پیروی کریں گے ان کو وہ اس عذاب میں ضرور پکڑے گا جو شیطان کے پیروؤں کے لیے اس نے مقدر کر رکھا ہے اور جس کی اس نے پہلے خبر دے رکھی ہے دوسری حقیقت یہ کہ جو لوگ ان واضح ہدایات کے بعد بھی راہِ حق کو چھوڑ کر شیطان کی پیروی اختیار کریں گے وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑیں گے بلکہ اپنا ہی بگاڑیں گے اسی لیے کہ خدا عزیز ہے یعنی نفع و نقصان سے بالاتر۔

اسی طرح حکیم کی صفت بھی یہاں دو حقیقتوں کو نمایاں کر رہی ہے۔ ایک تو یہ کہ اس دنیا کا خالق حکیم ہے اور اس کے حکیم ہونے کا بدیہی تقاضا ہے کہ وہ اپنی ہدایت پر جمے رہنے والوں اور اس سے منحرف ہو جانے والوں کے درمیان ان کے انجام کے لحاظ سے امتیاز کرے، اگر وہ ان میں کوئی امتیاز نہ کرے بلکہ دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ دے یا دونوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ حکیم نہیں ہے اور یہ دنیا ایک پر حکمت اور بامقصد کارخانہ نہیں بلکہ کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشا ہے۔ دوسری یہ کہ بدی اور نیکی کے نتائج کے ظہور میں جو دیر ہوتی ہے وہ سب حکمت پر مبنی ہوتی ہے بسا اوقات شیطان کے پیرو کاروں کو اللہ تعالیٰ مہلت دیتا ہے اور بسا اوقات اہل حق کسی آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں اس سے نہ تو اہل باطل کو مغرور ہونا چاہیے اور نہ اہل حق کو مایوس۔ بلکہ یہ یقین رکھنا چاہیے کہ وہ مہلت اور یہ آزمائش دونوں خدائے حکیم و دانا کی حکمت پر مبنی ہے۔[۲۰] عبداللہ یوسف علی نے لکھا ہے:

If you back-sbide after tne conviction has been brought home to you, you may cause some

inconvenience to the cause, or to these who counted upon you but do not be so arrogant as to suppose that you will defeat God's power and wisdom. ۲۱

مذکورہ آیت کے مضمون سے ان صفات کے ربط و تعلق کے متعلق مفسرین نے درج ذیل واقعہ بھی نقل کیا ہے۔

أن قارياً قرأ 'غفور رحيم' فسمعه أعرابي فأنكره ، وقال إن كان هذا كلام الله فلايقول كذا، الحكيم لا يذكر الغفران عند الزلل لأنه إغراء عليه. ۲۲ ایک قاری قرآن کی یہ آیت پڑھ رہا تھا۔ اس نے بھول کر **فاعلموا ان الله غفور رحيم** پڑھ لیا۔ ایک اعرابی قرآن پاک سن رہا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہوسکتا، کیوں کہ پہلے لغزش کا ذکر ہے اگر اس کے بعد **فاعلموا ان الله غفور رحيم** ہو تو اس سے لازم آئے گا کہ اللہ نے خود ہی گناہ پر ابھارا ہے کہ تم گناہ کرتے رہو اور میں بخشتا رہوں گا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے۔

(۳) هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمِ. (آل عمران:۶)

وہی ہے جو (ماؤں کے) رحموں میں جس طرح چاہتا ہے، تمہاری تصویریں بناتا ہے اس کے بغیر کوئی معبود نہیں (وہی) غالب اور حکمت والا ہے۔

''یعنی خدا کو قدرت ہے رحم میں جس طرح چاہے آدمی کا نقشہ تیار کردے، خواہ ماں باپ دونوں کے ملنے سے یا صرف قوت منفعلہ سے اسی لیے آگے فرمایا **هو العزيز الحكيم** یعنی زبردست ہے جس کی قدرت کو کوئی محدود نہیں کرسکتا اور حکیم ہے جہاں جیسے مناسب جانتا ہے کرتا ہے۔ اس نے ''حوا'' کو بدون ماں کے، مسیح کو بدون باپ کے، آدم کو بدوں ماں باپ دونوں کے پیدا کردیا۔ اس کی حکمتوں کا احاطہ کون کرسکتا ہے۔'' ۲۳

علامہ بقاعی کے نزدیک بھی عزیز اور حکیم اس قدرت اور حکمت کو ظاہر کرتے ہیں جس سے باری تعالیٰ مادر رحم میں تصویر سازی کرتا ہے۔ ۲۴

(۴) اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُکَ وَاِنْ تَغْفِرْلَهُمْ فَاِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمِ (المائدہ:۱۱۸)

اگر تو ان کو عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر ان کو بخش دے تو بلاشبہ تو ہی سب پر غالب (اور) بڑا دانا ہے۔

اس آیت مبارکہ میں عزیز اور حکیم سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا گناہوں سے درگزر فرمانا نہ تو کم زوری کی علامت ہے اور نہ اس کی سزا ہی حکمت سے خالی ہوتی ہے۔ علامہ مہائمی نے لکھا ہے کہ یہاں عزت اور حکمت کا ایک تقاضا تو سزا ہے مگر عبودیت کا تقاضا ہے کہ اس سزا کو اٹھالیا جائے۔۲۵

''تغفرلھم'' کے الفاظ کا تقاضا تو یہ تھا کہ آیت کے آخر پر غفور اور رحیم آتا مگر یہاں عزیز اور حکیم آیا ہے بظاہر ان صفات کا ماقبل مضمون سے ربط و تعلق واضح نہیں ہوتا۔ اس مسئلہ پر امام رازیؒ ۲۶ اور علامہ میبذیؒ ۲۷ نے اپنے اپنے اسلوب میں نفیس اظہارِ خیال کیا ہے۔

قرآن کریم میں ان دونوں صفتوں کا بالعموم اکٹھا ذکر اور اس کے ماقبل مضمون سے ربط و تعلق پر مولانا امین احسن اصلاحی کی یہ رائے بہت ہی جامع ہے۔

''قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی ان دونوں صفات کا حوالہ بالعموم ایک ساتھ آتا ہے اس سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات پر پورے غلبے کے ساتھ حاوی اور متصرف ہے، لیکن اس کے غلبہ و اقتدار کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ اس کے زور میں جو چاہے کر ڈالے بلکہ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے اس کا کوئی کام بھی حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔''۲۸

امام رازی کے بقول یہ صفات وعید اور وعدہ کی شان لیے ہوئے ہیں۔ ایک مثال سے صفت 'عزیز' میں وعید کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: جب باپ بیٹے کو یہ کہے ان عصیتی فانت عارف لی اگر تم نے میری نافرمانی کی تو تم مجھے جانتے ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے مجھے تم پر قدرت و دبدبہ حاصل ہے۔ فیکون ھذا الکلام فی الزجر ابلغ من ذکر الضرب وغیرہ اس کلام میں زیادہ دھمکی پائی جاتی ہے جو یہ کہنے میں نہیں

ہے کہ اگر تم نے میری نافرمانی کی تو میں تمہیں ماروں گا۔

حکیم میں رب تعالیٰ کے وعدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام رازی لکھتے ہیں:

''رب تعالیٰ کی حکمت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ نیک اور گناہ گار میں فرق کرے اور ساتھ ہی یہ واضح ہوا کہ جس طرح گناہ گار کو عذاب دینا اس کے حکیم ہونے کے مناسب ہے اسی طرح نیک کو ثواب عطا کرنا بھی اس کی حکمت کے لائق ہے، بلکہ نیک کو ثواب عطا کرنا زیادہ ہی حکمت کے مناسب ہے اور اس کی رحمت کے زیادہ ہی قریب ہے۔[۲۹]

صفت عزیز انسان کی کم زوری و ناتوانی کی مظہر ہے۔ یہ صفت انسان کو غرور و تکبر سے بچاتی اور عالم اسباب میں گم ہونے سے بچاتی ہے۔ عزیز کے ساتھ حکیم کی صفت انسان کو مصیبتوں پر صبر سکھاتی ہے اور نعمتوں کے ملنے پر شکر کی طرف راغب کرتی ہے۔ یہ دونوں صفات حکمران طبقے کو طاقت کے نشہ میں اختیارات کے اندھے استعمال سے بھی بچاتی ہیں۔

(ب) غفور:

غَـفَرَ کا مفہوم ڈھانپنا ہے۔ صفات افعال میں سے ''غـفور'' ظاہر کرتا ہے کہ پروردگار عالم ہماری ظاہری و باطنی نجاستوں کو محض اپنے فضل و کرم کی بنا پر، چادر رحمت سے ڈھانپ کر روزِ محشر عذابِ جہنم سے بچالیتا ہے۔ وہ پردہ پوشی ہی نہیں کرتا ہے بخشتا بھی ہے اور سیئات کو حسنات میں بھی بدل دیتا ہے۔ علامہ طیبی کے نزدیک تو فرشتوں کو ہماری بداعمالیاں بھلا دینا بھی اس کے غفور ہونے کا مظہر ہے۔[۳۰]

اپنے عصیاں شعار بندوں پر بے پناہ لطف و کرم کی وجہ سے ہی وہ خیر الغافرین (سورۃ الاعراف: ۱۵۵) ہے۔ یہ اسم مبارک قرآن کریم میں ان جوڑوں کی شکل میں آیا ہے۔

(الف) رحیم: [۳۱]

قرآن میں اکثر مقامات پر غفور، رحیم سے پہلے آیا ہے، مگر ایک مقام پر الرحیم پہلے ہے۔ (سبا: ۲)

(ب) حلیم: ۳۲

(ج) رب ۳۳

(د) عزیز ۳۴

(ہ) شکور ۳۵

(و) عفو ۳۶

(ز) ودود ۳۷

یہ فہرست ظاہر کرتی ہے کہ ''غفور'' دیگر جن اسماء کے ساتھ بھی استعمال ہوا ہے وہ خالق کی طرف سے مخلوق پر محبت، رحمت، درگزر اور مخلوق کی عزت افزائی کا مظہر ہیں۔

صرف غفور اور رحیم کے چند قرآنی استعمالات کا تذکرہ کیا جاتا ہے، تاکہ ان کے ماقبل مضمون سے ربط و تعلق اور انسانی زندگی پر اثرات کا جائزہ لیا جا سکے۔

(ا) حلّت و حرمت کے مسائل کے تذکرہ کے بعد حالت اضطرار میں حرام کے استعمال کی اجازت کے بعد غفور اور رحیم کا استعمال ہوا ہے۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. (البقرۃ:۱۷۳)

اللہ نے تمہارے اوپر حرام قرار دیا ہے مردہ کو، خون کو، سور کے گوشت کو اور ایسے مذبوحہ کے گوشت کو جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔ جو شخص مجبوری میں ہو اور وہ ان میں سے کوئی چیز کھائے، بغیر اس کے کہ وہ قانون شکنی کا ارادہ رکھتا ہو یا ضرورت کی حد سے تجاوز کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں، اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

سورۃ المائدۃ (آیت:۳) سورۃ الانعام (آیت:۱۴۵) اور سورۃ النحل (آیت: ۱۱۵) میں بھی اسی طرح یہ صفات آئی ہیں۔

اس آیت مبارکہ اور اسی مضمون کی دیگر آیات کے اختتام پر غفور اور رحیم کی صفات

یہ ظاہر کرتی ہیں کہ حالت اضطرار میں حرام کھانے پر اللہ تعالیٰ تمہارا مواخذہ نہیں کرے گا۔ یہ اس کی صفت غفور کا تقاضا ہے اور یہ رخصت عطا کرنا اس کی صفت رحیم کا تقاضا ہے۔

اسی طرح استغفار کا حکم دیا تو اس کے بعد بھی انہی صفات کو بیان کیا گیا تا کہ اللہ تعالیٰ کی بخشش وعطا اور رحمت وکرم کا پتا چل سکے۔

ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. (البقرۃ:۱۹۹)	پھر جہاں سے اور سب لوگ پلٹتے ہیں وہیں سے تم بھی پلٹو اور اللہ سے معافی چاہو یقیناً وہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

امام رازی فرماتے ہیں:

فهذا يدل قطعا على انه تعالىٰ يغفر لذلك المستغفر ويرحم ذلك الذى تمسك بجبل رحمته وكرمه. (رازی، فخر الدین، مفاتیح الغیب)	اس سے یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مغفرت طلب کرنے والے کی مغفرت فرماتا ہے اور اس شخص پر رحم فرماتا ہے جو اس کے جبل رحمت اور دین کرم کا سہارا لیتا ہے۔
(ب) وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. (الممتحنة: ۱۲)	اور اللہ تعالیٰ سے ان (خواتین) کے لیے مغفرت مانگا کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے محبوب ﷺ کو حکم دیتے ہیں کہ جو عورتیں ان شرائط کو قبول کر لیں اور ان باتوں کی پابندی پر آمادہ ہو جائیں تو آپ ان کی بیعت فرما لیں اور اس کے ساتھ ان کے لیے مغفرت کی دعا مانگیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ غفور اور رحیم ہے۔ جب آپ کے ہاتھ اٹھیں گے تو انھیں خالی نہیں لوٹایا جائے گا، بلکہ اللہ تعالیٰ آپ کی دعا کی برکت سے ان کے عمر بھر کے گناہوں کو، جن میں شرک وکفر سرفہرست ہے، بخش دے گا اور ان کے لیے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے گا۔[۳۸]

(ج) اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے تذکرہ کے بعد احساس شکر بیدار کرنے کے لیے بھی یہ صفات اکٹھی آئی ہیں۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَاتُحْصُوْهَا اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (النحل:۱۸)

اور اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتیں شمار کرنا چاہو تو ان کا شمار نہیں کرسکو گے یقیناً اللہ تعالیٰ غفور اور رحیم ہے۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ان گنت اور لامتناہی ہیں۔ ان کا شکر ادا کرنا تو ممکن ہی نہیں۔ ہم کس طرح شکر گزار بن سکتے ہیں؟ آیت کے آخری جملہ (ان اللہ غفور رحیم) میں اس سوال کا جواب ہے۔ اس کی وضاحت تفسیر نمونہ میں اس طرح کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ مہربان اور بزرگوار ہے کہ اپنی نعمتوں پر شکر کی طاقت نہ ہونے پر تمہارا مواخذہ کرے۔ اگر تم جان لو کہ تم سرتاپا اس کی نعمت میں غرق ہو اور اس کا شکر ادا کرنے سے عاجز ہو اور اپنا عذر کوتاہی اس کی بارگاہ میں پیش کرو تو تم نے اس کا بہت شکر ادا کیا ہے۔۳۹

سورۂ ابراہیم میں بھی اللہ کریم کی نعمتوں کو شمار نہ کرسکنے کا تذکرہ آیا ہے، مگر وہاں انسان کی کم زوریوں کا ذکر ہے۔

وَاِنْ تَعُدُّوْ نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ. (سورہ ابراہیم:۳۴)

اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو نہیں کرسکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی بے انصاف اور ناشکرا ہے۔

ان دونوں آیات (سورہ نحل:۱۸، سورہ ابراہیم:۳۴) کو پیش نظر رکھ کر غفور اور رحیم کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ بتایا ہے کہ جب میں نے تمہیں بے شمار نعمتیں عطا کیں تو اس کے نتیجے میں تم سے دو صفتیں ظاہر ہوئیں اور میری بھی دو صفتوں کا ظہور ہوا۔ تیری جو دو صفتیں ظاہر ہوئیں وہ یہ ہیں کہ تو نے میری نعمتیں حاصل کر کے میری نافرمانی کر کے اپنی جان پر ظلم کیا اور ان نعمتوں کا کفران کیا یعنی ناشکری کی اس لیے سورۂ ابراہیم میں انسان کی ان دو صفتوں کا ذکر فرمایا اور ان غیر متناہی نعمتوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی جن دو صفتوں کا ظہور

ہوا وہ یہ ہیں کہ وہ بخشنے والا اور بے حد رحم فرمانے والا ہے اور سورالنحل میں اپنی ان دو صفتوں کا ذکر فرمایا اور اس سے مقصود یہ ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے انسان! میں نے تجھے لاتعداد نعمتیں عطا فرمائیں تو پھر بھی ظلم کرتا ہے اور نافرمانی کرتا ہے اور میں معاف کر دیتا ہوں اور بخش دیتا ہوں اور تو ان نعمتوں کی ناشکری کرتا ہے اور میں تجھ پر رحم کرتا ہوں، تو اپنے عجز اور کوتاہی کو دیکھ، میں تیری کوتاہیوں کے مقابلے میں فیاضی سے کام لیتا ہوں اور تیری جفا کا بدلہ وفا سے دیتا ہوں۔'' ۴۰

(د) انسان خطا کا پتلا ہے۔ عموماً انسان کی کسی ایسی ہی کیفیت کے تذکرہ کے بعد غفور اور رحیم، یا غفور کے ساتھ دیگر صفات آئی ہیں۔ گویا یہ صفات انسان کو اس ادنیٰ حالت سے نکال کر بلند تر کیفیت کا حامل بناتی ہیں۔

سخت مشکلات اور سنگین حوادث، ان کی نوعیت کیسی ہی کیوں نہ ہو، تمام انسان غفور اور رحیم کے امید افزا اوصاف کی پناہ لیتے ہیں۔ خود اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کو یہ حکم ارشاد فرمایا کہ میرے بندوں کو میرے ان اوصاف کے بارے میں بتا دو تا کہ وہ تسخیر کائنات کے فریضہ سے غافل نہ ہو جائیں۔ اپنی حقیقت و عظمت کو فراموش نہ کر بیٹھیں۔ نَبِّئْ عِبَادِیْ اَنِّی اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْم . (الحجر:۴۹)

گناہ اور غلطی سے روکنے، سابقہ اعمال پر ندامت و پریشانی کے ازالہ یا استغفار کے حکم کے بعد ان صفات کا تذکرہ درحقیقت انسان کو مایوسی اور ناامیدی سے نکالتا ہے۔ مایوسی انسان کو گناہ پر آمادہ کرتی ہے، جیسا کہ حدیث میں ۹۹ آدمیوں کے قاتل کو مایوس کیا گیا تو اس نے ۱۰۰ ویں آدمی کو بھی قتل کر دیا مگر جب اسے مغفرت کی امید دلائی گئی تو یہی امید اسے گناہوں سے روکنے کا سبب بن گئی۔ ۴۱

غفور کے بعد رحیم اس بات کا اشارہ ہے کہ اگر غلطی اور لغزش سرزد ہو جائے تو صرف بخشش ہی نہیں لغزش کے ضرر رساں نتیجہ سے بھی انسان کو محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ ''غفور'' میں اگر مبالغہ ہے تو ''رحیم'' میں دوام و استمرار کا عنصر پایا جاتا ہے۔ البتہ ایک مقام پر رحیم غفور سے پہلے آیا ہے (سورہ سبا:۲) اس کی دو توجیہات کی گئی ہیں:

(الف) آسمانی برکات ومواہب کا نزول اس کی رحمت کا نتیجہ ہوتا ہے اور بندوں کے اعمال صالح "والعمل الصالح یرفعه" کے مطابق اوپر جاتے ہیں، اس کی مغفرت کو پالیتے ہیں۔

(ب) وہ لوگ جو ان نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں رحمت ان کے شامل حال ہوتی ہے اور وہ لوگ جو قصور وار اور گناہ گار ہیں، اگر حد سے نہ بڑھ جائیں تو مغفرت ان کے شامل حال ہوتی ہے۔۴۲

متعلقہ آیات کے سیاق وسباق میں یہ صفات الٰہیہ انسانی معاشرے پر گہرے تربیتی اثرات بھی رکھتی ہے۔ معاشرہ کی بنیاد اگر جنگ وجدال اور جوش انتقام پر ہو تو سکون اور اطمینان معاشرہ سے مفقود ہو جاتا ہے۔ انسان کے لیے صحیح رویہ یہ ہے کہ دوسروں کے ساتھ عفو درگزر کا معاملہ اختیار کرے نہ کہ تنگ کر کے ان کا جینا دوبھر کردے۔ عزت وعظمت معاف کرنے اور رحم کرنے سے ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے تو امید رکھتے ہیں کہ وہ ہماری کوتاہیوں اور لغزشوں کو معاف کرے، مگر ہم اپنے بھائیوں کی غلطیوں کو معاف کرنے کے لیے تیار نہیں۔

(ج) سمیع:

سمیع کا مادہ سمع ہے۔ اصل میں اس کا معنی سننے کی قوت ہے جس سے آواز کا ادراک کیا جاتا ہے۔ وھو قوة فی الاذن ، بھا تدرک الاصوات.۴۳

پروردگار عالم سمیع ہے، کیوں کہ وہ تمام اقوال والفاظ تمام زبانوں میں سننے والا ہے، بلکہ بے زبانوں کی بھی سنتا ہے۔

قرآن کریم میں یہ صفت درج ذیل جوڑوں کی شکل میں وارد ہوئی ہے۔

(ا) علیم ۴۴

(ب) بصیر: ۴۵

(ج) قریب ۴۶

سمیع علیم اور سمیع بصیر کا ماقبل احکام سے ربط و نظم کے سلسلہ میں چند آیات کے حوالہ سے مفسرین کی آراء درج ذیل ہیں۔

اللہ تعالیٰ علیم ہے کہ اس کا علم تمام اشیاء کے ظاہر و باطن پر محیط ہے۔ چیزیں چھوٹی ہوں یا بڑی، ان کے جزئیات و کلیات سے بھی آگاہ ہے۔[۴۷]

سمیع اور علیم بہت سی آیات میں اکٹھا آیا ہے۔

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرَاهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ. (البقرۃ:۱۲۷)

اور یاد کرو جب ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے (اور یہ دعا کر رہے تھے) اے ہمارے پروردگار ہمارا (یہ عمل) قبول فرما بے شک تو ہی سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں:

''اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ میں خدا کی ان دو صفتوں کا حوالہ ہے جن پر اعتماد کر کے بندہ خدا سے دعا کرتا ہے۔ اس کے اندر حصر کا جو مضمون ہے وہ دعا کرنے والوں کی طرف سے کامل سپردگی اور کامل اعتماد کا اظہار ہے۔''[۴۸]

(ب) اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۔ (آل عمران:۳۳-۳۴)

بے شک اللہ تعالیٰ نے آدم، نوح، ابراہیم اور عمران کے گھرانے کو چن لیا سارے جہان والوں سے، یہ ایک نسل ہے بعض ان میں سے بعض کی اولاد ہیں اور اللہ سب کچھ سننے والا (اور) سب کچھ جاننے والا ہے۔

''واللہ سمیع علیم میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو نبوت و رسالت کے لیے منتخب فرمایا یہ انتخاب تمام تر سمع و علم پر مبنی تھا۔ اس نے جن کو اس منصب کے لیے اہل پایا ان کا اس کے لیے انتخاب فرمایا۔ اس چیز کا انحصار تمام تر اہلیت و صلاحیت اور اللہ تعالیٰ کی حکمت و مصلحت پر ہے۔ اس میں کسی خاندان کے شرفِ ذاتی کو کوئی

دخل نہیں ہے، جیسا کہ شرف نسبی کے گھمنڈ میں مبتلا ہونے والوں نے کیا۔''۴۹

(ج) وَاِمَّا يَنْزِغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (الاعراف:۲۰۰)

اور اگر آپ کو شیطان کی طرف سے ذرا سا وسوسہ پہنچے تو فوراً اللہ سے پناہ مانگیے بے شک وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

''تمہارا رب سمیع وعلیم ہے تم جب بھی اس کی طرف رجوع کرتے ہو وہ تمہاری دعائیں اور فریادیں سنتا تمہارے حالات اور پریشانیوں کو جانتا ہے اور شیاطین کی فتنہ انگیزیوں اور چیرہ دستیوں سے بھی وہ اچھی طرح باخبر ہے۔ وہ تمہارے ہر غم کو دور فرمائے گا۔''۵۰

پیر محمد کرم شاہ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں: ''یعنی اللہ تعالیٰ تیری ہر بات بھی سنتا ہے اور تیری التجا کو بھی جانتا ہے وہ یقیناً تمہیں شیطان کے شر سے بچائے گا یا تیرے دشمنوں کے اقوال کو بھی سنتا ہے اور ان کے اعمال کو بھی جانتا ہے وہ خود اپنی قدرت سے تمہیں ان کے مکروفریب سے محفوظ رکھے گا تمہیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔''۵۱

سمیع وبصیر بھی جوڑے کی شکل میں متعدد مقامات پر آیا ہے اور ہمیشہ سمیع، بصیر سے پہلے ہے، کیوں کہ عموماً انسان کا قول فعل سے پہلے ہوتا ہے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

(الف) ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ (الحج:۶۱)

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی داخل کرتا ہے رات (کے کچھ حصہ) کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن (کے کچھ حصہ) کو رات میں اور اللہ تعالیٰ سب باتیں سننے والا (اور) سب کچھ دیکھنے والا ہے۔

امام ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

ای سمیع باقوال عباده، بصیر بهم لایخفی علیه منهم خافیة فی احوالهم وحرکاتهم وسکناتهم۔۵۲

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے اقوال سنتا ہے اور ان کے افعال دیکھتا ہے اس کی نگاہ سے بندوں کے احوال اور حرکات و سکنات سے کچھ پوشیدہ نہیں۔

(ب) اَللّٰهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلٰئِكَةِ رُسُلاً وَّمِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ. (الحج:۷۵)

اللہ فرشتوں میں سے بعض پہنچانے والے چن لیتا ہے اور انسانوں میں سے بھی۔ بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے۔

ان اللہ سمیع بصیر سے بیک وقت دو حقیقتوں کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ ایک اس طرف کہ جو خود سمیع و بصیر ہے سب کچھ سننے والا اور دیکھنے والا ہے اس کو ضرورت کیا ہے کہ وہ کسی کو اپنا شریک بنائے۔ دوسرا اس طرف کہ جب خدا سمیع و بصیر ہے تو وہ ان فرشتوں کے فرائض کی بھی ہر قدم پر نگرانی کر رہا ہے۔ مجال نہیں کہ وہ سرمو اس کے مقرر کردہ حدود سے متجاوز ہو سکیں۔۵۳

(ج) اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰى اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰهَ يَعِظُكُمْ بِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا. (نساء:۵۸)

بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حق داروں تک پہنچائی جائیں اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے لگو تو عدل کے مطابق فیصلہ کرو، خداوندِ عالم اچھی نصیحتیں فرماتا ہے، خدا سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

کان سمیعا بصیرا سے ظاہر ہوتا ہے کہ خالق کائنات ہمیشہ سے سمیع اور بصیر ہے، اس لیے عدالت و حکومت کے جس منصب پر فائز ہو وہ تمہارے اعمال دیکھ رہا ہے اور تمہاری گفتگو سن رہا ہے۔ اگر افعال و اقوال میں خیر ہوگی تو اس کی جزا ملے گی اور اگر شر ہوگا تو تمہارے نفس کو اس کی سزا پانی پڑے گی۔۵۴

سمیع کے ساتھ آنے والی تمام صفات ایسے مواقع پر آئی ہیں جہاں انسان اپنے اعمال و افعال کے محرکات میں بد اندیشی کا شکار ہوا یا دنیوی و مادی اور روحانی و عقلی الجھنوں کا شکار ہوا یا مختلف احکام و قوانین کا ذکر ہوا۔ ایسے حالات میں یہ صفات ان حالات سے نکلنے کی کلید ہیں۔

انسانی زندگی پر ان صفات کے بڑے گہرے اثرات ہیں۔ ان صفات میں حقیقی ایمان والوں کے لیے تشویق اور منافقین کے لیے تہدید اور دھمکی ہے۔ جب انسان کو یہ یقین ہو کہ اس کے اقوال لسانی اور نیت قلبی سے اس کا خالق آگاہ ہے تو وہ اپنے اعمال، افعال اور کردار کا خیال رکھے گا۔ عمل کی درستی کے ساتھ انہی صفات کا باطنی احساس ہے جو عمل کو معراجِ قبول تک پہنچاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب ماں بیٹی کو کہتی ہے کہ دودھ میں پانی ملا دو، امیر المومنین دیکھ بھی نہیں رہے، تو بیٹی نے فوراً کہا کہ اللہ تو دیکھ رہا ہے۔ وہ امیر المومنین سے زیادہ ہمارے قریب ہے اور باتیں بھی سن رہا ہے۔ بیٹی کے ذہن میں یہی صفات تھیں جو اسے برائی سے بچا رہی تھیں۔ اسی طرح حضرت ابن مسعودؓ سے منقول ہے کہ وہ بعض اصحاب کے ساتھ جنگل میں گئے۔ کھانا تیار کیا تو ایک چرواہے کو بھی دعوت دی۔ اس نے کہا میرا روزہ ہے۔ پوچھا اتنی سخت گرمی میں روزہ تو اس نے جواب دیا جہنم کی آگ اس سے بھی زیادہ گرم ہے۔ پھر اس سے کہا کہ بکریاں ہمیں دے دو ہم گوشت کی صورت میں ان کی قیمت تمہیں واپس کر دیں گے تو اس نے کہا کہ میں ان کا مالک نہیں۔ اس پر جب اس سے کہا گیا کہ مالک کو کہنا کہ بکریاں بھیڑیا کھا گیا یا بیابان میں گم ہو گئیں تو اس نے جواب دیا: این اللّٰہ؟ یعنی مالک کو تو کہہ دوں گا۔ جو اللہ ہماری باتیں سن رہا ہے اور ہمارے ان اعمال کو دیکھ رہا ہے قریب ہی ہے، اسے کیا جواب دیا جائے گا۔[۵۵]

یہ صفات اہل ایمان کو اطمینان قلبی اور سکون ذہنی عطا کرتی ہیں، کیوں کہ بندۂ مومن اپنی زیست کے لمحات اللہ کی حمایت میں بسر کر رہا ہوتا ہے۔ یہ صفات اس حقیقت سے نقاب کشائی بھی کرتی ہیں کہ فقط قانون سازی اور تنفیذ قانون سے حق و عدالت کا نظام قائم نہیں ہو سکتا، جب تک اللہ تعالیٰ کے سمیع، بصیر، قریب، اور علیم ہونے کی روح ہمارے اوپر سایہ فگن نہ ہو۔

صفات الٰہیہ کے اس تذکرہ سے درج ذیل نکات واضح ہوتے ہیں:

(۱) یہ صفات درحقیقت آئین الٰہی کی وہ دفعات ہیں جن کے تحت خالق کائنات

کوئی حکم ارشاد فرماتا ہے۔

(۲) جوڑوں کی صورت میں مذکور صفات کے مابین ایک ربط اور تعلق ہے۔

(۳) انسان کو ان صفات سے متصف ہونا چاہیے اور جہاں بانی وخلافت کا فریضہ ان کو پیش نظر رکھ کر انجام دینا چاہیے۔

(۴) ان صفات کا تصور انسانی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔

(۵) جس طرح مرکب اسماء آپس میں مربوط ہونے کے ساتھ ماقبل سے تعلق رکھتے ہیں اسی طرح مفرد اسماء بھی ماقبل آیت سے ایک نظم وربط میں منسلک ہیں۔

یہ قرآن کریم میں مذکورہ صفات الٰہیہ میں سے چند کا اجمالی ذکر ہے۔ کتاب حکمت میں مذکور ایک ایک صفت کو لے کر اگر ماقبل آیات سے اس کا تعلق معلوم کیا جائے تو اعجاز القرآن کے نئے نئے پہلو سامنے آئیں گے۔

حواشی ومراجع

۱۔ ابوالحسن علی ندوی، (۱۹۹۹ء) ارکان اربعہ، مجلس نشریات اسلام، کراچی ص: ۳۱۲-۳۱۳

۲۔ ان للہ تسعة وتسعین اسماً مائة الا واحدا من احصاها دخل الجنة. (صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب اسماء اللہ تعالیٰ وفضل من احصاہا)

۳۔ اس نکتۂ نظر کی وضاحت اس حدیث نبوی سے ہوتی ہے: جعل الله الرحمة فی مائة جزء فامسک عنده تسعة وتسعین جزء اً، وانزل في الارض جزء اً واحداً فمن ذلک الجزء یتراحم الخلق حتی ترفع الفرس حافرها عن ولدها، خشیة ان تصیبه (صحیح بخاری، کتاب الأدب، باب جعل الله الرحمة مائة جزء، صحیح مسلم، کتاب التوبة، باب في سعة رحمة الله تعالیٰ)

اللہ کی رحمت کے سو حصے ہیں اس نے ۹۹ حصے اپنے پاس رکھ لیے اور ایک حصہ زمین پر

نازل کیا۔اس ایک حصے کا اثر یہ ہے کہ مخلوق آپس میں رحمت والفت سے پیش آتی ہے یہاں تک کہ گھوڑا بچے پر پاؤں نہیں رکھتا کہ اسے کوئی تکلیف نہ پہنچ جائے۔

۴۔ زادالمسیر ،جلد۲،ص:۳۵۴

۵۔ یہ تفصیلات سورۃ البقرہ آیات ۲۲۶-۲۲۷ کے سلسلہ میں ہیں۔

۶۔ نظم وربط کی دریافت ایک اجتہادی امر ہے۔اس موضوع پر لکھنے والوں میں حافظ احمد بن ابراہیم بن الزبیر الثقفی (م:۷۰۸ھ) (البرہان فی تناسب سور القرآن)، ابوبکر عبد اللہ بن محمد بن زیاد نیشاپوری (م:۳۲۴ھ) شیخ ابن النقیب حنفی (تفسیر ابن النقیب)، بدرالدین محمد بن عبداللہ زرکشی، برہان الدین ابراہیم البقاعی (م:۸۰۹) (نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور) علامہ جلال الدین سیوطی (اسرار التنزیل)،علی بن احمد الحرالی (مفتاح الباب المقفل لفهم القرآن المنزل)، عتیق محمد الہروی سورآبادی (تفسیر سورآبادی) معروف ہیں۔

۷۔ الفیروزآبادی، مجدالدین، بصائر ذوی التمییز ،المکتبۃ العلمیۃ بیروت، جلد۴،ص:۶۱

۸۔ حاشیہ الصاوی علی الجلالین، دارالفکر بیروت ۲۰۰۳ء، جلداول،ص:۱۷۵

۹۔ رازی، فخرالدین محمد بن عمرو (۶۰۴) مفاتیح الغیب، دارالکتب العلمیۃ بیروت ۱۴۲۵ھ، جز۵،ص:۱۷۸

۱۰۔ القاسمی، جمالدین، محاسن التاویل، دارالفکر بیروت جلد۴،ص:۲۵۳

۱۱۔ محاسن التاویل جلداول،ص:۴۰۰

۱۲۔ الجزری، مبارک بن محمد، النہایۃ فی غریب الحدیث والاثر، مؤسسۃ اسماعیلیان قم، جلد اول ص:۴۱۹۔قرآن کریم میں درج ذیل مقامات ملاحظہ فرمائیے البقرہ:۱۲۹، ۲۰۹، ۲۲۰، ۲۲۸، ۲۴۰، ۲۶۰۔آل عمران:۶، ۱۸، ۶۲، ۱۲۶۔نساء:۲۶، ۵۶، ۱۵۸، ۱۶۵۔ مائدہ:۲۸، ۱۱۸۔انفال:۱۰، ۴۹، ۶۳، ۶۷۔التوبۃ:۴۰، ۷۱۔ابراہیم:۱۴۔نحل:۶۰۔ نمل:۹۔العنکبوت:۲۶، ۴۲۔الروم:۲۷۔لقمان:۹، ۲۷۔سبا:۲۷۔فاطر:۲۔الزمر:۱۔ غافر:۸۔جاثیہ:۲، ۳۷۔الاحقاف:۲۔الحدید:۱۔الحشر:۱، ۲۴۔الممتحنہ:۵۔صف:۶۔

الجمعۃ:۱،۳۔تغابن:۱۸

۱۳۔ قرآن کریم کے درج ذیل مقامات ملاحظہ فرمایئے:انعام:۹۶، غافر:۲،فصلت:۱۲، زخرف:۹

۱۴۔ بصائر جلد۲،ص:۳۶۰(قرآن کریم میں جبار صفت عزیز کے ساتھ سورہ حشر:۲۳میں آیا ہے)

۱۵۔ سورۃ الزمر:۵

۱۶۔ لیس:۵،دخان:۴۲

۱۷۔ ہود:۶۶،حج:۴۰،شوریٰ:۱۹،حدید:۲۵،مجادلہ:۲۱

۱۸۔ ابراہیم:۱،سبا:۶،بروج:۸

۱۹۔ اصلاحی،امین احسن،تدبر قرآن،فاران فاؤنڈیشن لاہور،۲۰۰۴ء جلد اول،ص:۲۹۸

۲۰۔ تدبر قرآن جلد اول،ص:۵۵۰-۴۹۹

۲۱۔ Abdullah Yusuf Ali, Holy Quran (Text, Translation and commentry, Lahore volume:1, Page 82

۲۲۔ مفاتیح الغیب،جلد ۵،ص:۱۷۸،النسفی،عبداللہ بن احمد بن محمود، مدارک التنزیل و حقائق التاویل،دارالکتب العلمیہ بیروت ۲۰۰۱ء،جلد اول،ص:۶۴

۲۳۔ عثمانی،شبیر احمد،تفسیر عثمانی،مکتبہ رشیدیہ لاہور،ص:۶۴

۲۴۔ ولما ختم سبحانه تعالیٰ بوصف العزة الدالة على الغلبة الدالة على كمال القدرة والحكمةالمقتضى لوضع شئ فى أحسن محاله واكملها المستلزم لكمال العلم تقديراً لمامرّمن التصوير وغيره. البقاعی،برہان الدین ابوالحسن ابراہیم(۸۸۵ھ)،دارالکتب العلمیہ ۱۴۲۴ھ جلد۲،ص:۱۴

۲۵۔ فالعزة والحكمة كما يقتضيان العذاب باعتبار كذلك رفعه باعتبار آخر فلذلك لم يعتبر فى التعذيب بل انمااعتبرت العبودية. المہائمی،علی بن احمد(۸۳۵ھ)،تبصیر الرحمٰن وتیسیر المنان،عالم الکتب بیروت جلد اول ص:۲۰۷

۲۶۔ مفاتیح الغیب:جلد۱۲،ص:۱۱۴

۲۷۔ المیبذی، رشید الدین، کشف الاسرار وعدۃ الابرار، مؤسسہ انتشارات امیر کبیر، تہران ۱۳۷۶، جلد ۳، ص: ۲۷۸-۲۷۹

۲۸۔ اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن، فاران فاؤنڈیشن لاہور ۱۹۷۴، جلد اول، ص: ۲۹۸

۲۹۔ مفاتیح الغیب، جلد ۵، ص: ۱۷۸

۳۰۔ غفور: لانه ینسی الملئکة افعالک (الطیبی: محمد بن عبداللہ (م: ۷۴۳) الکاشف عن حقائق السنن، کراچی ۱۴۱۳ھ، جلد ۵، ص: ۲۴)

غفور اور غفار میں فرق کرتے ہوئے علامہ طیبیؒ لکھتے ہیں: الغفار والغفور یدلان علیه علی المبالغة، ولعل المبالغة فی الغفور باعتبار الکیفیة، فی الغفار باعتبار الکمیة. (نفس مصدر)

غافر، غفور اور غفار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: انه غافر لمن له علم الیقین، وغفور لمن له عین الیقین وغفار لمن له حق الیقین۔ (نفس مصدر)

۳۱۔ قرآن کریم کے درج ذیل مقامات ملاحظہ فرمائیے:

البقرۃ: ۱۷۳، ۱۸۲، ۱۹۹، ۲۱۸، ۲۲۶۔ آل عمران: ۳۱، ۸۹، ۱۲۹۔ نساء: ۲۵۔ المائدہ: ۳، ۳۴، ۳۹، ۷۴، ۹۸۔ انعام: ۵۴، ۱۴۶، ۱۶۵۔ اعراف: ۱۵۳، ۱۶۷۔ انفال: ۶۹، ۷۰۔ التوبہ: ۵، ۲۷، ۹۱، ۹۹، ۱۰۲۔ یونس: ۱۰۷۔ ہود: ۴۱۔ یوسف: ۵۳، ۹۸۔ ابراہیم: ۳۶۔ حجر: ۴۹۔ النحل: ۱۸، ۱۱۰، ۱۱۵، ۱۱۹۔ حج: ۶۰۔ نور: ۵، ۲۲، ۳۳، ۶۲۔ نمل: ۱۱۔ قصص: ۱۶، زمر: ۵۳۔ فصلت: ۳۲۔ شوری: ۵۔ احقاف: ۸۔ حجرات: ۵، ۱۴۔ حدید: ۲۸، مجادلہ: ۱۲۔ ممتحنہ: ۱۲۷۔ تغابن: ۱۴۔ تحریم: ۱۔ مزمل: ۲۰

غفوراً رحیما کی شکل میں درج ذیل مقامات ملاحظہ کیجیے: نساء: ۲۳، ۹۶، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۶، ۱۱۰، ۱۲۹، ۱۵۲۔ فرقان: ۶، ۷۰۔ احزاب: ۵، ۲۴، ۵۰، ۵۹، ۷۳۔ فتح: ۱۴

۳۲۔ اسراء: ۴۴، فاطر: ۴۱، البقرۃ: ۲۲۵، ۲۳۵، آل عمران: ۱۵۵، المائدہ: ۱۰۱

۳۳۔ سبا: ۱۵

۳۴۔ فاطر: ۲۸، ملک: ۲

۳۵۔ فاطر:۳۰،۳۴،شوریٰ:۲۳

۳۶۔ مجادلۃ:۲،نساء:۴۳

۳۷۔ البروج:۸۵

۳۸۔ محمد کرم شاہ، پیر،ضیاء القرآن،ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور ۱۴۰۰ھ،جلد۵،ص:۲۰۶

۳۹۔ مکارم شیرازی، ناصر،تفسیر نمونہ،مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور، ۱۴۱۷ھ مترجم صفدر حسین نجفی،جلد۶،ص:۲۶۱-۲۶۲

۴۰۔ سعیدی،غلام رسول،تبیان القرآن،فرید بک اسٹال لاہور ۲۰۰۵ء،ص:۱۹۳-۱۹۴

۴۱۔ صحیح مسلم،کتاب التوبۃ،باب قبول توبۃ القاتل وان کثر قتلہ

۴۲۔ تفسیر نمونہ جلد:۱۰،ص:۳۲

۴۳۔ بصائر: جلد:۳،ص:۲۵۷

۴۴۔ قرآن کے درج ذیل مقامات ملاحظہ فرمائیں:

البقرۃ:۱۲۷،۱۳۷،۱۸۱،۲۲۴،۲۲۷،۲۴۴،۲۵۶۔آل عمران:۳۴،۳۵،۱۲۱،۷۶۔
الانعام:۱۳، ۱۱۵۔ الاعراف:۲۰۰، الانفال:۱۷،۴۲،۵۳، ۶۱۔ التوبۃ:۹۸،۱۰۳۔
یونس:۶۵، یوسف: ۳۴۔ الانبیاء:۴،نور: ۲۱،۶۰۔الشعراء: ۲۲۰۔العنکبوت: ۵،۶۰۔
فصلت:۳۶۔الدخان:۶۔حجرات:۱،نساء:۱۴۸

۴۵۔ درج ذیل آیات ملاحظہ فرمائیں: ۱، الحج:۶۱، ۷۵۔لقمان:۲۸۔ غافر:۲۰، ۵۶۔
الشوریٰ:۱۱۔المجادلہ:۱۔نساء:۵۸،۳۴

۴۶۔ سبا:۵۰

۴۷۔ ملا علی قاری کہتے ہیں:العالم البالغ فی العلم المحیط علمه السابق بجمیع الاشیاء ظاهرها وباطنها، دقیقها وجلیلها، کلیاتها وجزئیاتها. علی قاری،علی بن سلطان،مرقاۃ المفاتیح،مکتبۃ امدادیہ ملتان،جلد۵،ص:۸۱

۴۸۔ اصلاحی،امین احسن،تدبر قرآن،فاران فاؤنڈیشن لاہور ۱۹۷۶ء،جلد اول،ص:۲۹۴

۴۹۔ تدبر قرآن جلد اول ص:۶۷۸

۵۰۔ تدبر قرآن جلد۲،ص:۷۸۸

۵۱۔ ضیاء القرآن جلد۲،ص:۱۱۸

۵۲۔ ابن کثیر، ابو الفداء اسماعیل بن کثیر (۷۷۴ھ)، تفسیر القرآن العظیم، جمیعۃ احیاء التراث الاسلامی، کویت، ۲۰۰۰، جلد:۲،ص:۳۱۰

۵۳۔ تدبر قرآن جلد۴،ص:۴۲۳

۵۴۔ تفسیر تبصیر الرحمٰن میں ہے: **سمیعا لاقوالکم فی الامانات والاحکام بصیرا بافعالکم فیهما فان سمع ورأی خیرا جازکم علیه خیر الجزاء وان سمع ورأی شرا جازاکم علیه.** تبصیر الرحمٰن جلداول ص:۱۵۳

۵۵۔ اسماعیل حقی (۱۱۳۷ھ) روح البیان، دار احیاء التراث العربی، بیروت ۲۰۰۱ء، جلد:۸،ص:۲۵۵

قرآن، اہلِ کتاب اور مسلمان

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

قرآنِ کریم میں اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کے حالات پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان پر اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات، ان کی بداعتقادیوں اور بداعمالیوں کی تفصیلات اور ان کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے دی جانے والی سزاؤں اور تنبیہوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

اہلِ کتاب کے اس مفصل تذکرہ کا مقصد کیا ہے؟ اس میں مسلمانوں کے لیے عبرت و نصیحت کے کون سے پہلو ہیں؟ اور اس سے انہیں کیا رہنمائی ملتی ہے؟ اس کتاب میں ان موضوعات سے بحث کی گئی ہے۔ کتاب پر مولانا سید جلال الدین عمری کا مبسوط اور تحقیقی مقدمہ بھی ہے۔

عمدہ کاغذ، آفسیٹ کی حسین طباعت، دیدہ زیب سرورق، صفحات:۲۹۶ قیمت=/۷۰ روپے

ملنے کے پتے

ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر:۹۳ علی گڑھ ۱

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، دعوت نگر ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی ۲۵

اسلام اور تہذیبِ جنس

(۲)

——— مولانا سلطان احمد اصلاحی

شادی کے معیار میں تخفیف

اس سلسلے میں اسلام کی دوسری تاکید ہے کہ آدمی کو شادی کی ضرورت ہو لیکن اس کی مالی حالت اچھی نہ ہو اور وہ اپنے ہم رتبہ عورت سے شادی نہ کر سکے تو اس کو معیار میں تخفیف کر کے کم حیثیت لڑکی سے شادی کر لینی چاہیے۔ زمانۂ نزول قرآن میں جب کہ دنیا میں غلامی کا رواج تھا آزاد انسانوں کے مقابلے میں غلام مردوں اور عورتوں کی حیثیت بہت زیادہ پست تھی۔ یہاں تک کہ ان کو بیچا اور خریدا جاتا تھا اور باقاعدہ ان کی تجارت ہوتی تھی۔ اس کے باوجود اگر آدمی کی معاشی حالت ساتھ نہ دیتی ہو اور شادی کے بغیر اس کے لیے رہنا دشوار ہو تو قرآن نے اس وقت کے آزاد مردوں کو اس کی اجازت دی کہ وہ ان کم حیثیت باندیوں سے شادیاں کر لیں:

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلاً اَنْ	اور جس کو اس کی گنجائش نہ ہو کہ وہ آزاد
يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ	مسلمان عورتوں سے شادی کر سکے تو وہ
مَّامَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِنْ فَتَيٰتِكُمُ	تمہاری زیر ملکیت مسلمان باندیوں سے
الْمُؤْمِنٰتِ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ	رشتہ کر لے۔ اللہ کو تمہاری ایمانی حالت کا
بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ فَانْكِحُوْهُنَّ	اچھی طرح پتا ہے۔ حقیقت میں تم سب
بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ	ایک ہی نسل سے ہو۔ تو تم ان کے مالکوں
بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ	کی اجازت سے ان سے نکاح کر لو اور

مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ذٰلِکَ لِمَنْ خَشِیَ الْعَنَتَ مِنْکُمْ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (نساء: ۲۵)

دستور کے مطابق ان کو ان کا مہر ادا کرو۔ اس رشتہ سے ان کی نیت بھی مستحکم ازدواجی زندگی میں بندھ کر رہنے کی ہو، وقتی جنسی تسکین اور آشنائی اس کا محرک نہ ہو۔ (باندی سے رشتہ کی) یہ (سہولت) اس کے لیے ہے جس کو تم میں سے (اس کے بغیر) تنگی اور گناہ میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو۔ اور یہ کہ تم صبر سے کام لے سکو تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے۔ اور اللہ بڑا بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

آیت کریمہ کے آخر میں اگر چہ یہ بات کہی گئی ہے کہ آدمی صبر سے کام لے یہاں تک کہ اس کی مالی حالت اچھی ہو جائے اور وہ آزاد عورت سے شادی کر سکے تو یہ اس کے حق میں زیادہ بہتر ہے، اس لیے کہ باندی سے شادی کے نتیجہ میں اس سے ہونے والی اولاد ماں کی طرف سے غلام شمار ہوگی، جیسا کہ اس سے پہلے اس کا تذکرہ آچکا ہے [۱] اس طرح آیت کریمہ کا یہ ٹکڑا اس مشہور حدیث نبوی ﷺ کے ہم معنی ہے جس میں آپ ﷺ نے شادی نہ کر سکنے کی صورت میں نوجوانوں کو نفلی روزے رکھنے کی تاکید کی ہے تاکہ ان کو اپنی جنسی خواہش کو قابو رکھنے میں مدد ملے [۲] اس بنیاد پر یہاں 'صبر' کی تفسیر بھی روزے سے کی جاسکتی ہے یعنی کہ نفل روزوں کے ذریعہ آدمی اس شادی کو ٹالنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ اس کی یہ معروف تفسیر ہے جس کی تفصیل اپنے مقام پر دیکھی جاسکتی ہے۔ [۳] لیکن اس کے باوجود آیت کریمہ میں کئی پہلوؤں سے اس کی ترغیب دی گئی ہے کہ ضرورت کے تقاضے سے آزاد عورت سے شادی کرنے کی گنجائش نہ ہونے کی صورت میں بغیر شادی کے رہنے کے بجائے آدمی کو باندی سے شادی کر لینی چاہیے۔ اس لیے کہ آیت کریمہ میں باندیوں کی دو صفتوں ان کی جوانی اور ایمان کا حوالہ دیا گیا ہے۔ واقعہ ہے کہ جوانی اپنا مستقل حسن اور کشش رکھتی ہے۔ اور اس سے بہت کم فرق پڑتا ہے کہ جوان لڑکی آزاد ہے یا باندی یا وہ

کس برادری اور کس ذات اور کس قبیلے سے تعلق رکھتی ہے۔ جوانی کے اس حسن کے ساتھ اگر ایمان کی دولت بھی حاصل ہو تو آزادی اور غلامی کا سوال بہت پیچھے چلا جاتا ہے۔ اس سے آگے کے الفاظ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِاِیْمَانِکُمْ (اور اللہ کو تمہاری ایمانی حالت کا خوب پتا ہے) سے یہ بھی بتا دیا کہ کیا پتا کہ نیکی اور ایمان میں ہونے والی باندی کا درجہ آزاد شوہر سے بڑھا ہوا ہو۔ آگے کے حصے بَعْضُکُمْ مِنْ بَعْضٍ (تم سب کے سب ایک ہی نسل سے ہو) سے ذات برادری اور رنگ و نسل کے فتنے کی طرح آزادی اور غلامی کے فرق کی حقیقت بھی بتا دی کہ یہ انسانیت پر بعد میں طاری ہونے والی حالت ہے۔ ورنہ ساری انسانی آبادی جو ایک آدم و حوا کے بطن سے ہے، اس کے اندر قوموں اور قبیلوں کے فرق اور تفاوت کی طرح آزادی اور غلامی کا فرق بھی بعد میں آیا۔ اس لیے ذات برادری کے فرق کی طرح ضرورت کے تحت شادی کے معاملہ میں جوانی کے بعد ایمان کو جو سب سے اوپر رکھا ہے، یہی بات ابتداء آیت میں آزاد عورت کے معاملہ میں بھی قرآن نے کہی ہے:

.....اَلْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ..... (.....آزاد عورتیں جو ایمان کی دولت سے آراستہ ہوں.....[۴]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شادی کے معاملہ میں اسلام اور قرآن کی اولین ترجیح دین داری اور ایمان ہے۔ جو لڑکا اور لڑکی دین داری اور ایمان داری میں جتنا آگے ہو شادی کے معاملہ میں اس کو اسی درجہ ترجیح حاصل ہوگی اور دوسرے کے مقابلے میں اس کے انتخاب کو اوپر رکھا جائے گا۔ اس سے فقہاء اسلام میں ان لوگوں کی رائے کو تقویت حاصل ہوتی ہے جو شادی میں کفاءت کے معاملے میں دین داری کو سب سے مقدم رکھتے ہیں۔ یا یہ کہ تنہا اسی کو اس کا اصل معیار قرار دیتے ہیں۔ دوسرے موقع پر قرآن نے اس مضمون کو مزید کھول دیا ہے جہاں اس نے آزاد مشرک مرد و عورت کے مقابلے میں صاحب ایمان غلام اور باندی کو ان سے افضل قرار دیا ہے۔

وَلَا تَنْکِحُوا الْمُشْرِکٰتِ حَتّٰی یُؤْمِنَّ	اور مشرک عورتوں سے شادی نہ کرو جب
وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَیْرٌ مِّنْ مُّشْرِکَةٍ وَّلَوْ	تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں۔ اور

اَعْجَبَتْكُمْ وَلَاتُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا وَلَعَبْدٌ مُؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ اُولٰئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ وَاللّٰهُ يَدْعُوْآ اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ وَيُبَيِّنُ آيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ.
(بقرہ: ۲۲۱)

مسلمان باندی (آزاد) مشرک عورت سے زیادہ اچھی ہے اگر چہ اس سے تمہاری دل چسپی زیادہ ہو۔ اسی طرح مشرک مردوں سے اپنی عورتوں کا نکاح مت کرو جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہوجائیں۔ اور مسلمان غلام (آزاد) مشرک سے زیادہ اچھا ہے اگر چہ تمہاری اس میں دل چسپی زیادہ ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دوزخ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ جنت کی طرف اور اپنے حکم سے بخشش کی طرف بلاتا ہے۔ اور اپنی آیتوں کو لوگوں کے لیے کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ وہ یاددہانی حاصل کرسکیں۔

آیت کریمہ میں جوانی کے ساتھ ایمان کی صفت کا حوالہ ان الفاظ میں ہے:

مِنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ (نساء: ۲۵) تمہاری مسلمان جوان باندیوں سے۔

یہ الفاظ ترغیب کے لیے ہیں کہ جب باندی ایمان اور اسلام کی دولت سے آراستہ ہو اور اس کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہو تو ایک مسلمان کو اس کے سلسلے میں بہت زیادہ تردد اور پس وپیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ضرورت کے تقاضے سے بے تکلف اس سے شادی کرلینی چاہیے۔[۵] آیت کریمہ میں باندی سے شادی کی اجازت کے سلسلے میں آزاد عورت سے شادی کرنے کی استطاعت نہ ہونے کے ساتھ اس کی دوسری وجہ پریشانی اور مشقت سے چھٹکارا قرار دی گئی ہے:

ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ (نساء: ۲۵) یہ سہولت اس کے لیے ہے جس کو تنگی اور گناہ میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو۔

اس کی بنیاد پر فقہ میں ایک بات یہ کہی گئی ہے کہ آزاد عورت کے نکاح میں ہوتے ہوئے آدمی جنسی ناآسودگی کا شکار ہو اور دوسری آزاد عورت سے شادی کی استطاعت نہ

ہوتو اس پریشانی اور مشقت کو رفع کرنے کے لیے آزاد عورت کی موجودگی میں باندی سے نکاح کرسکتا ہے۔ خاص طور پر اس صورت میں جب کہ کسی باندی سے اس کا دل اس طرح لگ جائے کہ اس کے بغیر اس کو قرار ہی نصیب نہ ہوسکے۔ اسی ضرورت سے اس سے آگے آزاد عورت کی موجودگی میں ایک سے زائد باندیوں سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے۔[۶] حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک بھی اگر باپ اپنی کم سن لڑکی کی شادی کسی غلام سے کردے اسی طرح اپنے کم سن لڑکے کی شادی کسی باندی سے کردے تو یہ جائز ہوگا۔

ومن زوّج ابنته وهي صغيرة عبداً او زوّج ابنـــه وهـو صغيرامة فهو جائز[۷]	جوکوئی اپنی کم عمر لڑکی کی شادی کسی غلام سے کردے یا اپنے کم سن لڑکے کی شادی کسی باندی سے کردے تو ایسا کرنا جائز ہے۔

امام موصوف اس کی وجہ بیان کرتے ہیں کہ:

لان الاعـراض عـن الـكفـــاء ة لمصلحة تفوقها[۸]	اسی لیے کہ کفاءت سے روگردانی اس سے بڑی کسی مصلحت کے تحت ہی ہوسکتی ہے۔

آدمی کی معاشی حالت کم زور ہوتو آج کے حالات میں بسا اوقات برادری کے اندر بھی اسے معروف انداز کا ہم مرتبہ رشتہ نہیں مل پاتا ہے۔ جب کہ بعض صورتوں میں وہ برادری سے باہر جانے کے لیے مجبور ہوتا ہے، آیت کریمہ نے جب شادی کی ضرورت سے آزادی اور غلامی کے فرق کو بھی قابل لحاظ باقی نہیں رہنے دیا تو اس کی روشنی میں آج کے ذات برادری، علاقے اور زبان وغیرہ کے تفاوت کو کیا رکاوٹ اور مانع تسلیم کیا جاسکتا ہے؟ یہاں تک کہ اس معیار کے پیش نظر بعض اوقات خیال ہوتا ہے کہ دوسرے تمام پہلوؤں سے اگر لڑکا اور لڑکی قابل قبول ہو تو ذات برادری کی کرید کہیں جرم اور گناہ میں شامل نہ ہو۔

مستحکم ازدواجی زندگی کا عزم:

اسلام انسان کے جنس (Sex) کے مسئلے کو تہذیب وشائستگی کے جس دائرے میں رکھنے کو لازم خیال کرتا ہے اس کے لیے جوان اور ضرورت مند مردوں اور عورتوں کی وقت پر

شادی ہو جانا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ اس معاہدے (Contract) کا باقی رہنا اور اس رشتے کا مستحکم اور پائدار ہونا بھی ضروری ہے۔ شریعت محمدیؐ میں فطرت، مصلحت اور عقل عام کے تقاضوں سے ان رشتوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے جن سے کسی مرد کا زوجیت اور مصاہرت کا رشتہ قائم نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلے کی آخری کڑی ہے کہ جس عورت کا کسی مرد سے نکاح ہو جائے تو جب تک وہ اس کے نکاح میں ہے، اس سے کسی دوسرے مرد کا نکاح نہیں ہو سکتا۔[۹] اس حصار سے باہر نکل کر نکاح کے دوسرے تقاضوں کی تکمیل کے ساتھ خاص طور پر مہر کی ادائیگی کر کے وہ کسی بھی عورت سے نکاح کر سکتا اور اس کو اپنی زوجیت میں لا سکتا ہے۔ لیکن اس موقع پر قرآن کا اصرار ہے کہ یہ رشتہ استحکام کے عزم کے ساتھ ہونا چاہیے۔ صرف وقتی طور پر جنسی خواہش کی تسکین کو اس کا پہلا اور آخری محرک نہیں ہونا چاہیے:

..... وَاُحِلَّ لَكُمْ مَاوَرَاءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً (نساء: ۲۴)

.....ان (حرام کردہ رشتوں) کے علاوہ تمہارے لیے حلال ہے کہ تم اپنے مال کے ذریعہ اپنی نکاح کی خواہش پوری کرو۔ لیکن اس سے تمہارا ارادہ مستحکم ازدواجی زندگی کا ہو، عارضی جنسی تسکین اس کا محرک نہ ہو۔ تو (نکاح کے ذریعہ) تم جو عورتوں سے فائدہ اٹھاؤ تو ان کو اس کا معاوضہ (مہر) ادا کرنے میں دیر نہ کرو۔ یہ (اللہ کا ٹھہرایا ہوا) فریضہ ہے۔

سورہ مائدہ جو قرآن میں احکام کی آخری تکمیلی سورہ ہے اس میں نکاح کے لیے جائز عورتوں کے دائرے میں ایک مزید وسعت پیدا کی گئی ہے۔ وہ یہ کہ شریف اور پاک باز مسلمان عورت کی طرح ایسی ہی کتابیہ یہودی نصرانی عورت سے بھی مسلمان کے لیے نکاح کو حلال قرار دیا گیا ہے۔ لیکن اس موقع پر بھی عارضی جنسی لطف اندوزی کے بجائے نکاح کو مضبوط اور مستحکم رکھنے کا حکم دیا گیا ہے:

..... وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ .....(مائدہ: ۵)

...اور شریف مسلمان عورتوں کی طرح تم سے پہلے جن کو کتاب دی گئی ہے (یعنی یہود ونصاریٰ) ان کی شریف عورتیں بھی تمہارے نکاح کے لیے حلال ہیں۔ جب کہ تم ان کو ان کا معاوضہ (مہر) ادا کردو۔ البتہ اس سے تمہارا مستحکم ازدواجی زندگی کا عزم ہونا چاہیے۔ عارضی جنسی تسکین اور وقتی دوست بنالینا اس کا محرک نہیں ہونا چاہیے۔

آیت کریمہ کا اس کے بعد کا ٹکڑا مزید قابل توجہ ہے جس میں وعید ہے کہ نکاح کے اس معاملے کو ہلکا اور آسان نہ لیا جائے۔ معقول عذر کے بغیر نکاح کو بار بار توڑنا اور اللہ کے آخری دین کی ترجیحات کے مطابق مستحکم خاندان کے ادارے کی تشکیل کے بجائے اس رشتے کو صرف جنسی کھیل کا ذریعہ بنانا اتنا بڑا گناہ ہے کہ ایمان کے باوجود اس کافرانہ عمل کی نحوست سے آدمی کے تمام کیے کرائے پر پانی پھر سکتا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں وہ آخرت کے دائمی خسارے کی زد میں آسکتا ہے:

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (مائدۃ: ۵)

اور ایمان کو پاجانے کے بعد بھی جو کفر کے راستے پر عمل پیرا ہو تو اس کا تمام کیا کرایا اکارت ہے۔ اور آخرت میں وہ گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔

مسلمان مردوں کے ساتھ باندیوں سے نکاح کرنے کی صورت میں یہی بات ان کے لیے کہی گئی ہے۔ سورہ نساء کی آیت کریمہ کا یہ ٹکڑا اس سے پہلے آچکا ہے:

..... فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ .....(النساء: ۲۵)

.....تو تم مسلمان باندیوں سے ان کے مالکوں کی اجازت سے شادی کرلو۔ اور دستور کے مطابق ان کا معاوضہ (مہر) ادا کرنے میں دیر مت کرو۔ البتہ اس نکاح سے ان (باندیوں) کی نیت بھی مستحکم ہونی چاہیے۔ وقتی جنسی تسکین اور عارضی دوستوں کی تلاش اس کا محرک نہیں ہونا چاہیے۔

اس موقع پر ایک اشکال ہے اور وہ یہ کہ قرآن نے کسی دوسری جگہ آزاد عورتوں کے سلسلے میں نکاح کی اپنی اس شرط کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ اول یہ کہ جب باندیوں کے معاملے میں اس شرط کا ذکر دیا گیا تو آزاد عورتوں کے لیے تو بدرجہ اولیٰ اس کو لازم ہونا چاہیے اور ان کو اس کا زیادہ لحاظ ہونا چاہیے۔ اس کی دوسری وجہ آزاد عورتوں کی پردہ داری ہے۔ قرآن کے لیے نا قابل تصور ہے کہ نکاح میں آجانے کے بعد کوئی آزاد عورت کسی دوسری طرف نگاہ اٹھا کر بھی دیکھے۔ اس کے سلسلے میں ایک تیسری بات بھی کہی جا سکتی ہے۔ اور وہ یہ کہ عام طور پر سماج کے پس ماندہ اور کم زور طبقوں کی عورتوں میں نکاح کے احترام اور تقدس کا رجحان کم ہوتا ہے۔ اس وقت عرب کے سماج میں باندیوں کی یہی حالت تھی۔ ہندوستان کے پس ماندہ طبقات میں آج بھی اس صورت حال کا بہت کچھ مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ اس پس منظر میں سورہ نساء کی زیر نظر آیت کریمہ آزاد مردوں کے نکاح میں آنے والی باندیوں کے لیے قرآن کی تاکید ہے کہ اب ان کے طور طریقے کو بدل جانا چاہیے۔ اور ان کو نکاح کے اس مقدس رشتے کو زیادہ سے زیادہ مستحکم اور مضبوط بنانے کی فکر کرنی چاہیے۔

اس سلسلہ میں زیر نظر آیات میں تین الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ آخر میں ان پر نظر ڈالنی چاہیے:

مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْ اَخْدَانٍ (مائدۃ: ۵)	حفاظت چاہنے والے بن کر، صرف پانی بہانے والے اور آشنا بنانے والے کے طور پر نہیں۔
مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ (نساء: ۲۵)	حفاظت چاہنے والیاں بن کر، صرف پانی بہانے والیاں اور آشنا بنانے والیوں کے طور پر نہیں۔

احصان کے لفظی معنی بچانے اور محفوظ کرنے کے ہیں۔ "اصل الاحصان المنع"۔ اس موقع پر شادی کے لیے اس شرط کے اضافہ کا مطلب ہے کہ اس رشتے کو وہ

مستقل طور پر اپنی شرم گاہ کو محفوظ کرنے کا ذریعہ بنائیں۔ شادی شدہ مرد وعورت کو ''محصن'' یا ''محصَن'' یا ''مُحصِنة'' یا ''مُحصَنة'' اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اس کی بدولت دونوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ اپنے آپ کو جنسی بے راہ روی سے بچانے کی ضمانت حاصل ہو جاتی ہے۔[۱۱] آگے ''غیر مسافحین'' اور ''غیر مسافحات'' اس کی مزید تاکید کے لیے ہے۔ 'سفح' کے لفظی معنی پانی یا خون بہانے کے ہیں۔ اس سے نکلنے والے الفاظ 'سِفاح' اور 'مسافحة' کے معنی بدکاری اور زنا کاری (الزنا والفجور) کے ہوتے ہیں کہ عورت اور مرد کے حرام اور ناجائز تعلق میں ذمہ داری اور جواب دہی سے بچتے ہوئے صرف پانی بہانے اور جنسی تسکین حاصل کرنے کا جذبہ پایا جاتا ہے۔[۱۲] 'متخذی اخدان' اور 'متخذات اخدان' اس کی تیسری تاکید ہے۔ اس میں 'اخدان، خدن' کی جمع ہے جس کے معنی ساتھی 'مصاحب' کے ہیں۔ لیکن اس کا اکثر وبیش تر استعمال اس ساتھی کے لیے ہوتا ہے جس کو جنسی تسکین کے حصول کا ذریعہ بنایا جائے۔[۱۳] اس طرح سے دیکھا جائے تو یہ لفظ آج کے معروف بوائے فرینڈ اور گرل فرینڈ کے ہم معنی ہے۔ جسے آج کے حالات میں وسعت دے کر میل فرینڈ (Male Friend) اور فیمیل فرینڈ (Femal Friend) کر دینا مناسب ہے۔ اس لیے کہ آج کی ترقی یافتہ دنیا میں رشتۂ ازدواج سے باہر آزاد جنسی تعلق گرل اور بوائے سے نکل کر میل اور فیمیل تک پہنچ چکا ہے۔ ترقی یافتہ یورپ میں مرد وعورت دھڑلے سے شادی اور نکاح کے بغیر ایک ساتھ رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس ناجائز تعلق کے نتیجے میں ان کے بچے بھی ہو جاتے ہیں۔ بعد میں مرد اس عورت کو چھوڑ کر کسی دوسری عورت کے ساتھ رہنے لگتا ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح آگے چلتا رہتا ہے۔ اکثر و بیش تر مائیں ایسے بچوں کا بوجھ اٹھانے کے لیے مجبور ہوتی ہیں۔ جسے اس وقت یورپ اور امریکہ کی اصطلاح میں تنہا والدین (Single Parents) کہا جاتا ہے۔ اور اس وقت اس طرح کی ناجائز اولاد اس ترقی یافتہ دنیا کا بڑا مسئلہ ہے۔

نکاح کے ساتھ ان شرطوں کے اضافہ سے اللہ کی آخری کتاب نے قیامت تک اس کے ماننے والوں کے لیے اس فتنہ کی جڑ کاٹ دی ہے۔ قرآن کے اس نسخۂ کیمیا سے

دوسرے لوگ بھی اسی طرح اپنی شفایابی کا سامان کر سکتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ غفلت شعار دنیا کو اس نعمت کی قدر نہیں ہے۔ اور اس سے آنکھیں موند کر وہ لگاتار تہذیبی فنا (Cultural Extinction) کے راستے پر آگے بڑھتی جارہی ہے۔

شرم گاہ کی حفاظت

قرآن مجید مسلمان مرد اور عورت کو اس طرح مستحکم طور پر شادی کے بندھن میں باندھ دینے کے باوجود بار بار اس کی تاکید کرتا ہے کہ ان کی تمام تر جنسی دل چسپی شادی کے دائرے کے اندر ہونی چاہیے۔ اس سے باہر مسلمان مرد و عورت دونوں کو اپنی شرم گاہ کی حفاظت کا سخت اہتمام کرنا چاہیے۔ زمانۂ نزول قرآن میں جب کہ عرب میں غلامی کا رواج تھا، اس پس منظر میں مردوں کو ایک اضافی سہولت حاصل تھی کہ وہ اپنی بیوی کے علاوہ اپنی باندیوں سے بھی شوہر بیوی کا تعلق قائم کر سکتے تھے۔ لیکن اس عارضی اور وقتی سہولت سے ہٹ کر مسلمان مردوں کو سخت تاکید کی گئی کہ اپنی بیویوں اور باندیوں سے باہر ان کو اپنی شرم گاہ کی پوری حفاظت کرنی چاہیے۔ قرآن میں جا بجا اہل ایمان کی ان صفات کا بیان ہے جو اللہ سبحانہ تعالیٰ کو غیر معمولی طور پر پسند ہیں اور جن کو اپنا کر وہ کامیابی سے ہم کنار ہو سکتے اور جنت کے اعلیٰ ترین درجہ کے حق دار بن سکتے ہیں:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ..... وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْمَامَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَاءَ ذٰلِكَ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ..... اُولٰئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ

(مومنون:۱-۱۱)

ایمان والے مراد کو پہنچ گئے..... ان ہی میں وہ ہیں جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ سوائے اپنی بیویوں سے اور ان سے جو ان کے ہاتھ کی ملکیت ہیں تو ان کے معاملے میں ان پر کچھ کہا سنی نہیں ہے۔ ہاں جو اس سے آگے کا طلب گار ہو تو یہی حد سے بڑھنے والے ہیں۔..... یہی ہیں جو وراثت پانے والے ہیں۔ یہ جنت الفردوس کے وارث ہوں گے۔ جس میں کہ یہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

دوسرے موقع پر بھی اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ بندوں کی صفات میں اسی کا حوالہ ہے اور اس سے آراستہ ہونے والوں کو جنت کے اعزاز واکرام کا مستحق بتایا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْمَامَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَاءَ ذٰلِكَ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ..... اُولٰئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ (معارج:۲۹-۳۵)

اور وہ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ سوائے اپنی بیویوں سے اور ان سے جو ان کے ہاتھ کی ملکیت ہیں (یعنی کہ ان کی باندیاں) تو ان کے معاملے میں ان کے اوپر کچھ کہا سنی نہیں ہے۔ ہاں جو اس سے آگے کا طلب گار ہو تو یہی لوگ ہیں جو حد سے بڑھنے والے ہیں..... یہ وہ لوگ ہیں جنھیں جنت میں انتہائی عزت واحترام کے ساتھ رکھا جائے گا۔

یہ خطاب مسلمان مردوں سے تھا لیکن مسئلہ کی اہمیت اور نزاکت کے پیش نظر قرآن نے عورتوں کو بھی اس سلسلے میں آگاہ کرنا ضروری خیال کیا۔ سورۂ احزاب میں مسلمان مردوں اور عورتوں کی مطلوبہ جامع صفات کے بیان میں ایک دفعہ اس کو بھی قرار دیا:

..... وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ ..... (احزاب:۳۵)

.....اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والی عورتیں۔

دوسری جگہ خاص طور پر شادی شدہ مسلمان عورتوں کی صفت یہ بیان کی گئی کہ وہ نیک دین دار اور شوہروں کی فرماں بردار ہونے کے ساتھ ان کے غائبانہ میں ان کے مال و اسباب سے زیادہ ان کی عزت وآبرو کی حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں:

.....فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ (النساء:۳۴)

.....تو جو نیک عورتیں ہیں وہ فرماں بردار ہوتی ہیں اور اللہ نے ان کو جو (شوہروں کا) تحفظ فراہم کیا ہے تو اس کے بدلے وہ بھی غائبانہ کی حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں۔

اس موقع پر "قٰنِتٰت" کی تفسیر تو شوہر کی فرماں بردار سے کی ہی گئی ہے، اسی طرح "حٰفِظٰتٌ لِلْغَیْبِ" کی تفسیر میں کہا گیا ہے:

(حافظات للغیب) ای لفروجھن وغیرھا فی غیبة ازواجھن [۱۴]

'غائبانہ حفاظت کرنے والی' یعنی کہ اپنے شوہروں کی عدم موجودگی میں اپنی شرم گاہوں اور ان کے علاوہ دوسری چیزوں کی حفاظت کرنے والی۔

اسی طرح "بما حفظ اللہ' کی تفسیر میں صاحب جلالین کا کہنا ہے کہ:

(بما حفظ) لھن (اللہ) حیث اوصیٰ علیھن الازواج [۱۵]

'اللہ' نے ان کو جو حفاظت فراہم کی ہے یعنی کہ شوہروں کو ان کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی ہے۔

مسلمان مرد و عورت کے لیے اپنی شرم گاہ کی حفاظت کے سلسلے میں اللہ کی آخری کتاب کا یہ مثبت بیان تھا۔ اس کو مزید موکد کرنے کے لیے مسلمان مردوں اور عورتوں کو اس کے خلاف منفی آگاہی بھی دی گئی ہے۔ مسلمان مرد و عورت شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ ان کو ہر حال میں زنا کاری اور بدکاری سے اپنے کو دور رکھنا چاہیے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں اولاد کے قتل اور عام قتل کی حرمت کے بیان کے بیچ میں زنا کاری اور بدکاری سے دور رہنے کی تاکید ہے جس سے قرآن کی نظر میں اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے:

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِیْلاً (بنی اسرائیل: ۳۲)

اور زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو۔ یہ کھلی ہوئی بے حیائی کا کام ہے۔ اور اس کا راستہ بڑا برا راستہ ہے۔

دوسری جگہ یہی بات اللہ کے محبوب بندوں کی امتیازی صفت کے طور پر بیان کی گئی ہے کہ وہ زنا کاری اور بدکاری کے گناہ سے اپنے کو دور رکھتے ہیں۔ یہاں بھی اس کا تذکرہ شرک اور قتل جیسے بڑے گناہوں کے ساتھ ہے۔ اس سے بھی کتاب اللہ کی نظر میں اس برائی اور خرابی کی شناعت کو آسانی کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے:

وَالَّذِيْنَ لَايَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهاً اٰخَرَ وَلَايَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَاماً (فرقان: ۶۸)

اور اللہ کے محبوب بندے اس کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے اور اس جان کو جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے اسے قتل نہیں کرتے سوائے اس کے کہ اس کے اوپر کوئی حق مرتب ہوتا ہو۔ اسی طرح یہ زنا کاری کا ارتکاب نہیں کرتے اور جو کوئی ایسا کرے گا اسے اس گناہ کا انجام بھگتنا ہوگا۔

اس طرح کے موقع پر جب بات مذکر کے صیغے سے کہی جاتی ہے تو قرآن کے معروف اسلوب کے مطابق وہ مردوں کے ساتھ خاص نہیں ہوتی۔ بلکہ مرد و عورت اس کے خطاب میں یکساں طور پر شامل ہوتے ہیں۔ اس طرح زنا کاری اور بدکاری سے دور رہنے کی جو بات مسلمان مردوں کے حوالہ سے کہی گئی ہے، مسلمان عورتیں بھی اس میں اسی طرح شامل ہیں۔ اس کے باوجود کتاب اللہ نے الگ سے بھی اس کے متعلق طبقۂ خواتین کو متوجہ کرنا ضروری خیال کیا ہے۔ اللہ کے آخری رسول ﷺ کو اپنے زمانہ میں مسلمان خواتین سے بیعت لیتے وقت جن دفعات کی نشان دہی کی گئی ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ وہ زنا کاری اور بدکاری سے اپنے آپ کو دور رکھیں گی۔ یہاں بھی یہ مضمون شرک، چوری اور قتل اولاد جیسے بڑے گناہوں کے درمیان ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَاجَاءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰى اَنْ لَايُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْئاً وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ ..... فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (ممتحنة: ۱۲)

اے نبی آپ کے پاس جو مسلمان عورتیں اس پر بیعت کرنے کے لیے آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو ساجھی نہ ٹھہرائیں گی اور چوری نہ کریں اور زنا کاری نہ کریں گی اور اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی..... تو ایسی عورتوں سے آپ بیعت لیجیے۔ اور ان کے لیے اللہ سے بخشش کی دعا بھی کرتے رہیے۔ بلاشبہ اللہ بڑا بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

نبی ﷺ کی احادیث ان آیات کریمہ کی تفسیر ہیں جن میں اسی طرح مسلمان مردوں اور عورتوں کو زنا کاری اور بدکاری سے دور رہنے کی تلقین کی گئی ہے اور اس جرم کی شدت اور شناعت کو مختلف طریقوں سے نمایاں کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں شرک اور قتل اولاد جیسے بڑے گناہوں کے ساتھ ایک گناہ اسے قرار دیا کہ:

ان تزانی حلیلة جارک ۔۱۶ — یہ کہ تم اپنے پڑوسی کی عورت کے ساتھ زنا کاری کرو۔

دوسرے موقع پر اس کی خرابی کی مزید وضاحت میں فرمایا:

لان یزنی الرجل بعشر نسوة اَیْسَرُ علیه من ان یزنی بامرأة جاره. ۱۷ — آدمی دوسری دس عورتوں کے ساتھ زنا کاری کرے یہ اس سے زیادہ ہلکا ہے کہ وہ اپنے پڑوسی کی عورت کے ساتھ زنا کاری میں ملوث ہو۔

اسی طرح ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

مامن ذنب بعد الشرک اعظم عند الله من نطفة وضعها رجل فی رحم لایحل له. ۱۸ — شرک کے بعد اللہ کے نزدیک اس سے بڑھ کر دوسرا گناہ نہیں کہ کوئی شخص اپنے نطفہ کو ایسی بچے دانی میں ڈالے جو اس کے لیے حلال نہیں۔

یہ خطاب مردوں سے تھا۔ طبقۂ خواتین کے سلسلے میں ارشاد ہوا:

خیر النساء امرأة اذا نظرت الیها سرتک ، واذا اَمرتها اطاعتک ، واذا غبت حفظتک فی نفسها ومالک .۱۹ — سب سے اچھی عورت وہ ہے کہ جب تم کو اس کو دیکھو تو تمہارا دل خوش ہو جائے اور جب تم اس کو کسی کام کے لیے کہو تو وہ اس کو لپک کر انجام دے۔ اور جب تم اس کو چھوڑ کر کہیں جاؤ تو اپنی ذات اور تمہارے مال دونوں کو تمہارے لیے بچا کر رکھے۔

نیز یہ کہ:

اذا صلت المرأة خمسها، وصامت شهرها، وحفظت فرجها، واطاعت زوجها قيل لها ادخلي الجنة من اى الابواب شئت. [۲۰]

جو عورت ایسی ہو کہ وہ پانچوں وقت کی نماز کی پابندی کرے، پورے رمضان کا روزہ رکھے اور پوری تندہی سے اپنے شوہر کا حکم بجالائے تو (قیامت کے دن) اس سے کہا جائے کہ وہ جس دروازے سے چاہے جنت میں داخل ہو جائے۔

محرکاتِ زنا سے دوری

اس کے ساتھ ہی اسلام کی تاکید ہے کہ زنا کے ساتھ محرکات اور مقدمات سے بھی اپنے کو دور رکھا جائے۔ اس میں سرِفہرست 'غضّ بصر' ہے یعنی مسلمان مرد و عورت اجنبی مردوں اور عورتوں کو دیکھنے سے پرہیز کریں۔ اچانک نگاہ پڑ جائے تو فوراً ہٹالیں۔ کسی موقع پر دیکھنا ضروری ہو تو ضرورت سے زائد ہرگز نہ دیکھا جائے۔ قرآن نے اس حکم کا بیان مرد و عورت کے لیے شرم گاہ کی حفاظت کے ساتھ جوڑ کر کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے حصول میں اس پر عمل درآمد غیر معمولی طور پر معاون ہے۔ اسی طرح 'غض بصر' میں کوتاہی ہو جائے تو مسلمان مرد و عورت کے لیے شرم گاہ کی حفاظت اتنی ہی مشکل ہو جاتی ہے:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ..... (نور: ۲۹)

(اے پیغمبر!) مسلمان مردوں سے کہیے کہ وہ اپنی نگاہوں کو نیچی رکھیں اور (اس طرح) اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کا انتظام کریں.....۔

نیز یہ کہ:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ ..... (نور: ۳۰)

اور (اے پیغمبر) مسلمان عورتوں سے کہیے کہ وہ بھی اپنی نگاہوں کو نیچی رکھیں اور (اس کے ذریعہ) اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کا انتظام کریں۔

اجنبی مرد وعورت کے ایک دوسرے کو دیکھ سکنے کے معاملے میں سب سے زیادہ گنجائش حضرات حنفیہ کے ہاں ہے۔ ان کے یہاں بھی اس کی صراحت ہے کہ عورت اگر کسی اجنبی مرد کو شہوت کے غلبے یا اس کے امکان کے ساتھ دیکھے تو اس صورت میں اس کے لیے اپنی نگاہوں کو نیچی کر لینا مستحب ہے، لیکن اسی کیفیت کے ساتھ مرد بھی اس کو دیکھے تو اس کے لیے ایسا کرنا صاف طور پر حرام اور ناجائز ہے۔[۱۲] ساتھ ہی اختلاط مرد وزن اور دوسری کم زوریوں اور خرابیوں سے بھی مردوں اور عورتوں کو بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اس کی تفصیل اپنے موقع پر کی جا چکی ہے۔

سزاؤں کا اہتمام

اس کے بعد بھی جو مرد وعورت قابو میں نہ آئے اس کے لیے اسلام نے سخت سزا تجویز کی ہے۔ زنا کا ارتکاب کرنے والا مرد وعورت اگر شادی شدہ ہے تو اسلام میں اس کی سزا 'رجم' یا سنگ سار کیا جانا ہے۔ یعنی اسلامی ریاست کے زیر اہتمام ایسے مرد وعورت پر پتھر برسائے جائیں گے، تا آنکہ ان کی موت واقع ہو جائے۔ یا یہ کہ تلوار سے قتل یا کسی دوسرے ذریعہ سے ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ شادی شدہ نہ ہونے کی صورت میں ایسے مرد وعورت کو سو کوڑے کی مار لگائی جائے گی جیسا کہ قرآن مجید کی سورہ نور کی پہلی آیت کریمہ میں اس کی صراحت ہے۔ اس سے کم تر جنسی جرائم کے لیے شریعت میں 'تعزیر' کی سزا ہے۔ جس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

حواشی ومراجع

۱۔ امام غزالیؒ کے حوالہ سے اس کا ذکر پیچھے آ چکا ہے۔

۲۔ ابوبکر جصاص رازیؒ کے حوالہ سے آپ ﷺ کی مشہور حدیث پہلے آ چکی ہے۔

۳۔ احیاء علوم الدین: ۱/۱۶۶، بحث 'اسرار العلوم' مطبعہ عامرہ شرفیہ، مصر ۱۳۲۶ھ

۴۔ آزاد عورتوں کی اس صفت کے بارے میں صاحب جلالین کا یہ کہنا ہے کہ یہ غالب

حالت کے لحاظ سے ہے اور اس کا کوئی مطلب نہیں ہے: ھو جری علی الغالب فلا مفھوم لہ۔ تفسیر الجلالین: ص ۱۰۴۔ بہت کم زور ہے۔ اس موقع پر یہ صفت آیت کریمہ کے اس حصے کی جانب، جیسا کہ آگے باندیوں کے سلسلے میں بھی یہ اس حصے کی جان ہے۔ من فتیکم المومنت۔ الحمدللہ کہ ہماری تفسیر سے صاحب جلالین کے اس خیال کی تردید ہوتی ہے۔ کتاب اللہ کے کسی لفظ اور حرف کو زائد اور بے مفہوم کہنے سے بہتر ہے کہ آدمی اس کے سلسلے میں اپنے عجز کا اعتراف کرے۔ واللہ الموفق۔

۵ اوپر 'محصنات' کی صفت اور یہاں باندیوں کے سلسلے میں ایمان کی صفت جلالین کے نزدیک زائد اور بے مفہوم ہے۔ لیکن جس طرح اوپر آزاد عورتوں کے معاملے میں ان کی بات کم زور ہے، باندیوں کے معاملے میں بھی اس کا کوئی وزن نہیں ہے۔ وما العلم الا عند اللہ العلیم الحکیم۔

۶ بدایۃ المجتہد: ۴۳/۲، دار المعرفۃ، بیروت

۷ ہدایہ: ۳۰۲/۲، کتب خانہ رشیدیہ دہلی۔

۸ حوالہ سابق

۹ اس سے صرف ایک استثناء ہے۔ کافروں سے جنگ میں ان کی عورتیں قیدی بن کر مسلمانوں کے قبضے میں آئیں تو اگر اس کے برعکس کا ان سے کوئی معاہدہ نہ ہو تو اپنے پچھلے غیر مسلم شوہروں سے ان کا رشتہ لوٹ کر وہ فاتح مسلمانوں کے لیے حلال ہو جاتی ہیں۔ جیسا کہ سورۂ نساء کی آیت کریمہ: ۲۴ کے ابتدائی حصہ میں اس کی صراحت ہے: والمحصنت من النساء الا ما ملکت ایمانکم کتب اللہ علیکم۔ (اسی طرح ان عورتوں سے (تمہارے لیے نکاح کرنا حرام ہے) جو پہلے سے کسی کے عقد نکاح میں ہوں سوائے ان (غیر مسلم) عورتوں کے جو جنگ میں تمہارے قبضے میں آجائیں۔ یہ اللہ کا تمہارے لیے فیصلہ ہے) اس کے بعد آیت کریمہ کا ٹکڑا ہے جو آگے آتا ہے۔

۱۰ اس طرح کے پس منظر میں یہی محل سورۂ نور کی آیت کریمہ: ۳۴: وَلَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَیْکُمْ اٰیٰتٍ مُّبَیِّنٰتٍ الخ اور سورۂ طلاق کی آیات: ۸-۱۲ کا سمجھ میں آتا ہے: وَکَاَیِّنْ مِّنْ قَرْیَۃٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّھَا وَرُسُلِہٖ اِلٰی آخِرِ السُّورۃ۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۱۱ ابن منظور الافریقی م ۷۱۱ھ: لسان العرب: ۱۲۱/۱۲، دار صادر بیروت۔

۱۲ لسان العرب: ۴۸۵/۱۰-۴۸۶، طبع مذکور

۱۳ ابوالقاسم الحسین بن محمد المعروف بالراغب الاصفہانی م۵۰۲ھ: المفردات فی غریب القرآن/۱۴۴، دارالمعرفۃ، بیروت، تحقیق وضبط، محمد سید کیلانی، طبع جدید۔
۱۴ تفسیر الجلالین/۱۰۶، طبع جدید، دارالمعرفۃ، بیروت۔
۱۵ حوالہ سابق۔
۱۶ تفسیر ابن کثیر: ۳/۳۲۶، مطبعہ تجاریہ کبریٰ، مصر ۱۹۳۷ء۔
۱۷ حوالہ سابق۔
۱۸ حوالہ سابق۔
۱۹ تفسیر ابن کثیر: ۱/۴۹۱، محولہ بالا۔ نیز احکام القرآن المصباحی: ۲/۲۲۹۔
۲۰ حوالہ سابق۔
۲۱ ہدایہ: ۴/۴۴۴، کتب خانہ رشیدیہ دہلی۔

غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق

مولانا سید جلال الدین عمری

ہندوستان کے پس منظر میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کیسے تعلقات ہونے چاہئیں؛ یہ موضوع کافی اہمیت اختیار کر گیا ہے، اس لئے کہ فرقہ پرستوں نے اس سلسلہ میں بہت سی غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں۔ مثلاً انھوں نے یہ پروپیگنڈا کیا ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کے علاوہ دوسروں کو موجبِ گردن زنی قرار دیتا ہے اور اس میں مذہبی رواداری اور توسّع نہیں پایا جاتا۔ اس کتاب میں غیر مسلموں کے ساتھ حسنِ سلوک ان کی مذہبی آزادی اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان معاشرتی، معاشی اور سیاسی تعلقات پر اسلامی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ فاضل مصنف کے جاندار اور رواں دار قلم نے سلیس اور دلکش اسلوب میں پیچیدہ مسائل کی گتھی سلجھائی ہے۔

ہندوستان کے پس منظر میں غیر مسلموں سے تعلقات کے موضوع پر اپنی نوعیت کی پہلی مفصل کتاب، دعوت وتبلیغ کے میدان میں کام کرنے والوں کی ایک اہم ضرورت

آفسیٹ کی حسین طباعت، عمدہ کاغذ، صفحات: ۳۳۲ قیمت (مجلّد) =/۱۰۰ روپے

ملنے کے پتے

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳ علی گڑھ-۱

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، دعوت نگر ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵

سیر وسوانح

شریف لاہیجی - حیات وخدمات

——— پروفیسر کبیر احمد جائسی

ایران کے صفوی بادشاہوں کے عہد حکومت میں فارسی زبان میں متعدد تفسیریں معرض وجود میں آئیں جو تمام کی تمام شیعی نقطۂ نظر کی ترجمان تھیں۔ ان میں سے فارسی کی اولین تفسیر ''آیات الاحکام'' جس کا نام مفسر نے ''تفسیر شاہی'' رکھا ہے، اس پر ہم تفصیل سے اظہار خیال کر چکے ہیں۔ (ملاحظہ کیجیے سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ، اپریل - جون، جولائی - ستمبر ۲۰۰۵ء) صفویوں ہی کے دور کی ایک اور فارسی تفسیر ہے۔ خوش قسمتی سے اس تفسیر کے چند مکمل مخطوطے بعض کتاب خانوں میں محفوظ ہیں جن کا تقابلی مطالعہ کر کے جناب میر جلال الدین حسینی محدث ارموی نے اس کا ایک ناقدانہ متن مرتب کیا ہے اور اس پر ایک طویل بیش قیمت مقدمہ لکھ کر ''تفسیر شریف لاہیجی'' کے نام سے ادارۂ کل اوقاف تہران کی طرف سے ۱۹۶۴ء میں چار جلدوں میں شایع کروایا ہے۔ شائع شدہ صفحات کی تعداد تین ہزار چھ سو اڑتالیس ہے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ جلدوں کی تقسیم مفسر کی ہے یا مرتب کی۔ محدث ارموی کا مقدمہ اگرچہ بڑی محنت سے لکھا گیا ہے، مگر اس کی سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ وہ عربی زبان کی لمبی لمبی عبارتیں بغیر فارسی ترجمے کے نقل کیے چلے جاتے ہیں جس کی وجہ سے ہندوستانی فارسی دانوں ہی کے لیے نہیں، بلکہ ایرانی فارسی دانوں کے لیے بھی ان کے مقدمہ سے پورا پورا استفادہ ناممکن تو نہیں، مشکل ضرور ہو جاتا ہے۔ اس مقدمے کی مدد سے یہاں شریف لاہیجی کے حالات زندگی اور علمی خدمات پر کچھ روشنی ڈالی جا رہی ہے۔

میر جلال الدین حسینی محدث اُرموی کو شریف لاہیجی کی تاریخ ولادت کا علم نہیں ہو سکا، لیکن انھوں نے اپنی تحقیق کے دوران شریف لاہیجی کی ایک دوسری تصنیف ''محبوب

القلوب'' کی ایک عبارت سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ شریف لاہجی ۱۰۵۸ھ میں فارغ التحصیل ہوکر پختہ عالم وفاضل ہو چکے تھے۔اسی عبارت سے میر جلال الدین حسینی محدث اُرمَوی نے یہ بھی قیاس کیا ہے کہ ۱۰۵۸ھ میں ان کی عمر کم از کم تیس برس ورنہ پینتیس چالیس برس رہی ہوگی۔ان قیاسات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شریف لاہجی کی ولادت ۱۰۱۸ھ سے لے کر ۱۰۲۸ھ کے درمیان ہوئی ہوگی۔ یعنی صفویوں کے پانچویں بادشاہ، شاہ عباس (م ۱۰۳۸ھ) کے مرنے سے پہلے شریف لاہجی کی ولادت ہوچکی ہوگی اور بظن غالب شاہ عباس کی موت کے وقت ان کی عمر دس برس کی رہی ہوگی۔شریف لاہجی کی تاریخ ولادت ہی کی طرح ان کی تاریخ وفات کا یقینی علم نہیں ہے۔ان کی تفسیر کے مطالعے سے اتنی بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ ۲۴ ربیع الاول ۱۰۸۶ھ کے دن شریف لاہجی اس تفسیر کی تصنیف سے فارغ ہوئے تھے۔علاوہ برایں میر جلال الدین حسینی ارموی نے ''محبوب القلوب'' کے ایک حاشیہ کی مدد سے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ شریف لاہجی ۱۰۸۸ھ تک زندہ تھے۔یعنی انھوں نے چھٹے صفوی بادشاہ، شاہ صفی، ساتویں بادشاہ عباس دوم اور آٹھویں بادشاہ سلیمان اول کا عہد حکومت دیکھا اور سلیمان اول (م ۱۱۰۵ھ) کے مرنے سے قبل اس دنیا کو خیر باد کہا۔

مذکورہ حاشیے کے مل جانے کے باوجود میر جلال الدین حسینی محدث اُرمَوی نے اپنی تحقیق جاری رکھی۔ دوران تحقیق ان کو ''محبوب القلوب'' کا ایک ایسا مخطوطہ ملا جس پر شریف لاہجی کے فرزند شیخ ابوسعید کی ایک تحریر ہے جس میں ۱۰۹۵ھ میں شریف لاہجی کو مرحوم لکھا گیا ہے اس سے میر جلال الدین حسینی محدث ارموی نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ شریف لاہجی کی وفات ۱۰۸۸ھ اور ۱۰۹۵ھ کے درمیان ہوئی ہوگی۔اگر ان کا سنہ ولادت ۱۰۱۸ھ اور سنہ وفات ۱۰۹۵ھ تسلیم کرلیا جاتا ہے تو انتقال کے وقت ان کی عمر ۷۷ برس رہی ہوگی اور اگر ۱۰۲۸ھ کو ان کا سنہ ولادت اور ۱۰۹۵ھ کو سنہ وفات مانا جاتا ہے تو ان کا انتقال سرسٹھ (۶۷) برس کی عمر میں ہوا ہوگا۔

گزشتہ سطور میں شریف لاہجی کی ایک کتاب ''محبوب القلوب'' کا حوالہ دیا جاچکا ہے۔اس کتاب کے خاتمے پر انھوں نے اپنے جو حالات عربی زبان میں تحریر کیے ہیں

ان کو اردو زبان میں کچھ یوں لکھا جا سکتا ہے۔

شریف لاہیجی نے اپنا نام قطب الدین ابن محمد بن شیخ علی عبدالوہاب بن پیلہ فقیہ الاشکوری الدیلمی اللاہیجی لکھا ہے۔ اشکور، دیلم کے مضافات میں واقع ہے اس کے اور سکنا نا (آج کا لاہیجان) کے درمیان تقریباً سات فرسخ کا فاصلہ ہے۔ یہ ان علاقوں میں سے ہے جن کی آب وہوا معتدل، پانی میٹھا اور پہاڑ بلند وبالا ہیں۔ شریف لاہیجی کے پردادا پیلہ فقیہ الاشکوری، فقیہ، صالح اور نحو وصرف اور معانی وبیان کے ماہر تھے۔ گیلانیوں کی زبان میں پیلہ کا لفظ ''بڑے'' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چوں کہ وہ ایک بڑے فقیہ تھے اس لیے ''پیلہ فقیہ'' کہلاتے تھے۔ شریف لاہیجی کا بیان ہے کہ اس علاقے کے اس وقت کے حکمراں نے ان کو اپنے وطن سے نقل مکانی کر کے لاہیجان چلے جانے کا حکم دیا تھا، مگر انھوں نے یہ تحریر نہیں کیا کہ حکمرانِ وقت نے ایسا کیوں کیا تھا؟

شریف لاہیجی نے اس زمانے کی ایک اور اہم شخصیت سید محمد یمنی کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ اسی زمانے میں جب پیلہ فقیہ کو اپنا وطن چھوڑ دینے کا حکم ہوا تھا سید محمد یمنی شاہِ روم کے خوف سے نقل مکانی کر کے اپنے بیٹے سید علی اور پوتی فاطمہ کے ساتھ شاہ تہماسپ صفوی کے دار السلطنت قزوین میں جا کر اس کے دربار میں پناہ کے طالب ہوئے۔ شاہ تہماسپ نے ان کو اپنے ایک مقرب درباری قاضی محمد راضی کے گھر میں ٹھہرایا۔ تین ماہ بعد وہیں قزوین میں سید محمد کا انتقال ہوا۔

چوں کہ قزوین کی آب وہوا سید محمد یمنی کے افراد خاندان کو راس نہیں آ رہی تھی اس لیے شاہ تہماسپ نے ان لوگوں کو گیلان چلے جانے کی اجازت دے دی اور لاہیجان کے حکمراں کو فرمان جاری کیا کہ ان لوگوں کے ساتھ اکرام واحترام کا برتاؤ کرے۔ اجازت پا کر سید علی اپنی پوتی فاطمہ کے ساتھ قزوین سے اشکور آئے اور شریف لاہیجی کے دادا پیلہ فقیہ کے گھر ٹھہرے۔ پیلہ فقیہ کو بھی اشکور سے لاہیجان منتقل ہونا تھا۔ چناں چہ دونوں خاندان کے افراد ایک ساتھ لاہیجان چلے گئے۔ وہاں لاہیجان کے حاکم نے میدان نامی محلّہ میں ایک قطعہ اراضی پر مکان تعمیر کرا کے سید علی کو اس میں ٹھہرایا۔ لاہیجان میں اب یہ جگہ

سکناناکے نام سے معروف ہے۔

ساتھ ساتھ سفر کرنے اور ایک دوسرے کے قریب رہنے کی وجہ سے دونوں خاندانوں میں ایسی یگانگت ہوئی کہ شیخ سید علی نے اپنی پوتی فاطمہ کا نکاح شریف لاہجی کے دادا مولانا عبدالوہاب بن پیلہ فقیہ سے کر دیا۔ انہی فاطمہ کے بطن سے شریف لاہجی کے والد شیخ مولانا علی کی ولادت ہوئی۔ شریف لاہجی کا بیان ہے کہ مولانا عبدالوہاب بن پیلہ فقیہ کا انتقال مولانا علی کے بچپن ہی میں ہوگیا تھا۔ شریف لاہجی کی دادی سیدہ فاطمہ نے اپنے صاحب زادے مولانا علی کی بہترین تربیت کی جس کے نتیجے میں وہ اپنے معاصرین میں ممتاز ونمایاں رہے۔ عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اپنے علاقے میں شیخ الاسلام اور مرجع خلائق بنتے چلے گئے اور ان کی شہرت گیلان سے نکل کر پورے ایران میں پھیل گئی۔

ان کے بارے میں شریف لاہجی نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ معقول قامت، حسنِ صورت اور حسنِ سیرت کے مالک تھے۔ خوش گفتار، خوش مزاج، صاف ستھرے کپڑے زیب تن کرنے والے، دنیا کی رنگینیوں سے کنارہ کش، انسانوں کے کام آنے والے، اپنا زیادہ تر وقت فقرا اور مساکین کے ساتھ گزارنے والے، دل بہلانے کے لیے کچھ وقت ہنسی مذاق اور خوش گپیوں میں گزارنے والے بھی تھے جس کی وجہ سے ان کے بعض ظاہر بین معاصرین نے انھیں ہلکے پن اور بے وقاری کا طعنہ دیا تھا۔

شریف لاہجی کے والد کا نکاح شیخ الاولیا والاتقیا شیخ رضا کیا کی خانقاہ کے متولی اور مشہور منجم شیخ المشائخ شیخ اسماعیل کی صاحب زادی سے ہوا جن کے بطن سے چار لڑکے پیدا ہوئے۔ شریف لاہجی کا بیان ہے کہ ان کے والد کا ترسٹھ برس کی عمر میں اچانک انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال کے بعد شریف لاہجی کے بڑے بھائی شیخ جلال ان کے جانشین ہوئے۔ شیخ جلال اپنے والد کے تمام اوصاف سے متصف تھے۔ انھوں نے کوئی لمبی عمر نہیں پائی اور اپنے والد کے انتقال کے تین ہی برس بعد اس دنیا سے کوچ کر گئے۔

شریف لاہجی کا بیان ہے کہ شیخ جلال ان سے تین برس بڑے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد باپ اور بھائی کی تمام ذمہ داریاں شریف لاہجی کے کاندھوں پر آپڑیں۔

انھوں نے اس بات پر افسوس کیا ہے کہ ان کو مہلت نہ مل سکی کہ وہ اہل علم کی خدمت میں حاضر ہو کر علوم وآداب حاصل کرتے اور کھرے کھوٹے میں تمیز کرنے کے قابل ہو سکتے۔ لیکن شریف لاہجی کو اس میں بھی خیر کا پہلو نظر آیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ''آج کل کے علما کی خدمت میں رہنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ان علما کی صحبت سے صرف وبال، تکلیف اور قیل وقال کی کثرت ہی حاصل نہیں ہوتی ہے۔ ان میں سے بیش تر خواہشات نفس کے پیرو اور دنیا کی طرف مائل ہیں۔ ایسے عالم کو اللہ تعالیٰ علم کے باوجود گم راہ کر دیتا ہے۔ اس کا دل سخت کر دیتا ہے، اس کے کان اور دل پر مہر لگا دیتا ہے اور اس کی نگاہ پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ اگر وہ دنیا کی طرف سے منھ پھیر لیتا تو اس کا درجہ بلند ہو جاتا اور وہ برائیوں سے محفوظ رہتا، مگر وہ خواہشات نفس کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ وہ تحصیل علم میں خواہ کتنی ہی وادیاں طے کر لے مگر وہ گدھے کے مثل ہے جس پر کتابیں لدی ہوں۔ اے اللہ مجھے اپنے علاوہ کسی کا محتاج نہ بنا۔ ہماری زبانوں پر صرف تیرا ذکر ہو اور ہمارے دل صرف تیری طرف مائل ہوں''۔

درج بالا عبارت سے شریف لاہجی کے پردادا، والد، دادی اور بڑے بھائی کے ناموں اور کچھ حالات کا علم ہو جاتا ہے، مگر نہ تو ان کے دو اور بھائیوں کے بارے میں کوئی علم ہو پاتا ہے نہ خود ان ہی کے بارے میں ہم کو کچھ تفصیلی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ شریف لاہجی نے اپنے دور کے علماء کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ اس لحاظ سے بہت اہم ہیں کہ ایک عالم اپنے طبقے کے افراد کے بارے میں جب ان خیالات کا حامل ہے تو اس کے زمانے کے عوام ان علماء کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہوں گے اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں ہے۔

میر جلال الدین حسینی محدث ارموی نے شریف لاہجی کی مذکورہ بالا تحریر سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے اور منابع کا استعمال کر کے شریف لاہجی کی قدرے واضح تصویر منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے اور ان کے خط وخال کو اپنے طویل مقدمہ میں جس حد تک ممکن ہو سکا ہے ابھار کر اپنے قاری کو ان سے روشناس کرانے کی سعی بلیغ کی

ہے۔ اس لیے ہم ان کے مقدمہ سے استفادہ کرتے ہوئے چند خاص امور کی طرف اپنے قارئین کی توجہ مبذول کرانا مناسب سمجھتے ہیں۔

اولین بات تو جاننے کی یہ ہے کہ قطب الدین یا بہاء الدین بن شیخ علی شریف لاہیجی کے نام میں شریف کا لاحقہ کیوں لگا ہے؟ میر جلال الدین حسینی محدث ارموی کا خیال ہے کہ عربوں میں لفظ ''شریف'' ''سید'' کے متبادل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اس لفظ ''سید'' کا اطلاق فارسی زبان میں اس شخص پر ہوتا ہے جس کا سلسلۂ پدری ہاشم سے جا کر مل جاتا ہو۔ لفظ شریف بھی اسی قبیل کا لفظ ہے، لیکن فارسی زبان میں اس اصطلاح کا اطلاق اس پر ہوتا ہے جو اپنے سلسلۂ مادری سے ہاشمی ہو۔ میر جلال الدین حسینی محدث ارموی کے نزدیک شریف لاہیجی پر یہی اصطلاح منطبق ہوتی ہے، یعنی وہ سلسلۂ پدری سے نہیں سلسلہ مادری سے ہاشمی تھے۔[۲]

محدث ارموی نے اپنے مقدمہ میں یہ بھی تحریر کیا ہے کہ شریف لاہیجی، محقق داماد (میر محمد باقر داماد متوفی ۱۰۴۱ھ) کے شاگرد تھے۔ صرف اس ایک جملہ کے علاوہ انھوں نے شریف لاہیجی کی تعلیم، تعلیم سے فراغت اور بعد ازاں کسب معاش کے ذرائع کے بارے میں کوئی معلومات فراہم نہیں کی ہیں۔ گمان غالب یہ ہے کہ ان کو اس طرح کی معلومات حاصل ہی نہ ہوسکی ہوں گی۔ یہ تو ممکن نہیں کہ کوئی شخص کسب معاش کے بغیر زندگی گزار سکے۔ اس لیے امید ہے کہ شریف لاہیجی نے بھی کوئی نہ کوئی کام ضرور کیا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ دربار شاہی سے منسلک رہے ہوں، مگر جہاں تک ہم مطالعہ کر سکے ہیں اس طرح کی بات نہ تو کسی مؤرخ نے لکھی ہے نہ کسی تذکرہ نگار نے۔ ایک قابل تعجب بات یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر محمد معین نے اپنی مرتب کردہ فرہنگ فارسی میں شریف لاہیجی کا تذکرہ لکھتے ہوئے ان کی کتابوں ثمرہ الفواد، رسالہ عالم مثال اور محبوب القلوب کا نام تو درج کیا ہے، مگر ان کی فارسی تفسیر کا نام تک نہیں لیا ہے۔[۳]

اس سے قبل یہ تحریر کیا جا چکا ہے کہ شریف لاہیجی کی پیدائش ۱۰۱۸ھ سے لے کر ۱۰۲۸ھ کے درمیان ہوئی ہوگی۔ اس سے ہم نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ ان کی ولادت شاہ عباس

(اول) کے عہد حکومت میں ہوئی ہوگی اور اس کے مرنے کے وقت شریف لاہیجی دس برس کے لڑکے یا بیس برس کے نوجوان رہے ہوں گے۔ محدث ارموی کا یہ بیان بھی ہم نقل کر چکے ہیں کہ وہ ۱۰۵۸ھ میں فارغ التحصیل ہوئے تھے۔ اگر اس بیان کو مان لیا جائے اور نہ ماننے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے، تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ شریف لاہیجی کی شخصیت کی تشکیل شاہ صفی کے زمانے میں ہوئی ہوگی۔ شاہ صفی کا سال جلوس ۱۰۳۸ھ ہے۔ وہ جس وقت تخت سلطنت پر بیٹھا تھا اس کی عمر سترہ برس کی تھی۔ اس نے چودہ برسوں تک حکمرانی کی اور ۱۰۵۲ھ میں اس دنیا سے رخصت ہوا۔ مذکورہ چودہ برسوں میں اس نے جو ظلم وستم ڈھائے تھے اس کا مختصر سا ذکر ڈاکٹر محمد معین نے ان الفاظ میں کر دیا ہے:

''وی بسیار بیرحم وخونریز بود وگروہی از امرا وبزرگان رانابود کرد.....'' [۴]

وہ بے رحم اور خون بہانے والا تھا۔ اس نے امرا اور سرداروں کی ایک جماعت کو نابود کر دیا تھا۔

ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا نے صفویوں کے مجموعی کردار پر اپنی کتاب تاریخ ادبیات در ایران جلد پنجم حصہ اول میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے شاہ اسماعیل دوم، شاہ سلطان خدابندہ (یہ دونوں صرف چند ماہ کے لیے تخت نشین ہوئے تھے) کے علاوہ شاہ صفی، شاہ سلیمان، شاہ سلطان حسین اور شاہ تہماسپ دوم کے عہد ہائے حکومت کو تاریخ ایران کا ''ناسازگار ترین'' دور قرار دیا ہے اور شاہ صفی (سال جلوس ۱۰۳۸ھ م ۱۰۵۲ھ) کے عہد حکومت کو تو انھوں نے ''یکی از بدترین دورہ ہائے خون آشامیٔ تاریخ ایران'' (تاریخ ایران کی بدترین خونریزیوں کے ادوار میں سے ایک دور) قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا نے انتہائی تفصیل سے تمام صفوی بادشاہوں کی خوں خواری، اعزہ کشی، شراب نوشی، معجون افیون خوری اور دیگر بداعمالیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ جن حضرات کو اس موضوع سے دل چسپی ہو وہ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا کی کتاب تاریخ ادبیات در ایران جلد ۵ حصہ اول کا مطالعہ کر لیں۔ ہم کو یہاں صرف اتنا دکھانا مقصود ہے کہ شریف لاہیجی کا عہد حیات کس ماحول سے عبارت ہے اور ان کو اپنی عزت وآبرو بچانے کے لیے کیا کیا جتن نہ کرنے پڑے ہوں گے۔ ایک بات

اور، شاہ سلیمان (اصل نام صفی مرزا، سال جلوس ۱۰۷۸ھ م ۱۱۰۵ھ) کے عہد حکومت میں ۱۰۸۶ھ میں شریف لاہیجی کی تفسیر مکمل ہوئی تھی۔ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا کا بیان ہے کہ اس بادشاہ کے عہد حکومت میں ملا محمد باقر مجلسی (م ۱۱۱۰ھ) کا مذہبی معاملات میں بڑا عمل دخل تھا اور کسی فرد واحد کو اس بات کا یارانہ تھا کہ وہ کسی مسئلہ پر ان سے اختلاف کرتا۔ افسوس ہے کہ اس بات کا علم نہ ہو سکا کہ شریف لاہیجی کے ملا محمد باقر مجلسی سے کیسے تعلقات تھے؟ وہ شریف لاہیجی کی تفسیر سے واقف بھی تھے کہ نہیں؟ اور اگر واقف تھے تو اس کی علمی حیثیت کے بارے میں ان کا کیا خیال تھا؟ اس طرح کی کوئی بات نہ تو میر جلال الدین حسینی محدث ارموی نے لکھی ہے اور نہ ہم کو دوران مطالعہ مل سکی۔ ڈاکٹر محمد معین نے اِس سلیمان صفوی کی شخصیت کے بارے میں جو کچھ تحریر کیا ہے اس کو نقل کر دینا مناسب ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں:

''صفی میرزا بہ نام شاہ سلیمان برتخت نشست و ۲۹ سال سلطنت کرد و انواع بی رحمی و قساوت قلب از او سرزد۔ ہنگام غضب یا درمستی احدی از ندیمان او از جان خود ایمن نہ بود، بریدن دست و گوش و بینی یا درآوردن چشم نزد وی از کارہائے معمولی بود۔ و آنانکہ مقرب تر بودند بیشتر دوچار بلا و مشقت گشتند.....'' ۵

صفی مرزا شاہ سلیمان کے نام سے تخت سلطنت پر بیٹھا اور اس نے ۲۹ برسوں تک حکومت کی۔ اس سے طرح طرح کی بے رحمی اور قساوت سرزد ہوئی۔ مستی یا غضب کے عالم میں اس کا کوئی بھی ندیم اپنی جان سے محفوظ نہ تھا۔ ہاتھ، کان اور ناک کٹوالینا یا کسی کی آنکھیں نکلوالینا اس کے لیے معمولی باتیں تھیں۔ وہ لوگ جو اس کے قریب ترین تھے زیادہ بلا و مصیبت میں گرفتار ہوئے۔

یہاں اس بات کا ذکر بھی نامناسب نہ ہوگا کہ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا نے صفویوں کے زمانے کے ایک جشن کا خاص طور سے ذکر کیا ہے جو ''جشن عمر کشان'' کے نام سے موسوم تھا۔ معلوم نہیں یہ جشن اب بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ ڈاکٹر ذبیح اللہ کا کہنا ہے کہ اگر یہ جشن منانا ہی تھا تو ۲۴ ذی الحجہ کو منایا جاتا، لیکن (اس زمانے کے) شیعہ ۹ ربیع الاول کو مناتے

تھے۔ چوں کہ اس جشن کا تعلق شریف لاہیجی کے عہد حیات سے ہے اس لیے اس کا ذکر کر دیا گیا، ورنہ شریف لاہیجی کے سلسلے میں اس کی ضرورت نہ تھی۔

میر جلال الدین حسینی محدث ارموی نے لکھا ہے کہ اس تفسیر کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تکمیل ہندوستان میں ہوئی تھی۔ اس بات کو لکھنے کے بعد ان کو یہ بھی لکھنا پڑا ہے کہ:

''این موضوع بر ابہام شرح مال مفسر می افزاید و برای ماحل ایں معمہ ممکن نہ شد کہ در چہ زمان و چگونہ مفسر از لاہیجان بہ ہند رفتہ و تفسیر را در آنجا بہ پایار سانده است''۔

یہ موضوع مفسر کے حالات زندگی پر شکوک وشبہات کا اضافہ کرتا ہے۔ ہم اس معمے کو حل نہ کر سکے کہ کس زمانے میں اور کس طرح مفسر لاہیجان سے ہندوستان گئے اور وہاں انھوں نے اپنی تفسیر مکمل کی۔

چوں کہ تفسیر کے اصل متن سے اس بحث کا کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے ہم اس سے صرف نظر کرتے ہیں۔

اسی سلسلۂ سخن میں یہ بتلا دینا بھی ضروری ہے کہ میر جلال الدین حسینی محدث ارموی نے ہندوستان میں شایع ہونے والی ایک فارسی تفسیر ''تفسیر البہیۃ'' کو بہ دلائل شریف لاہیجی کی تفسیر کا ایک حصہ بتلایا ہے جو سورہ فاتحہ سے لے کر سورۂ کہف کی تفسیر پر مشتمل ہے۔ محدث ارموی نے مثالیں دے کر یہ بھی واضح کیا ہے کہ ''البہیۃ'' کے مرتب نے تفسیر شریف لاہیجی میں بہت کچھ قطع و برید کر دی ہے اور بعض بعض مسائل کی توجیہ و تشریح کرتے ہوئے اصل متن سے ہٹ کر شریف لاہیجی کے منھ میں اپنی زبان ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ مذکورہ تفسیر البہیہ ایک دوسری تفسیر ''لوامع التنزیل وسواطع التاویل'' کے حاشیے پر شایع ہوئی ہے۔

شریف لاہیجی نے کلام پاک کی تفسیر لکھنے کے علاوہ یہ کتابیں بھی لکھی ہیں:

۱۔ رسالۂ مثالیہ ۲۔ محبوب القلوب ۳۔ خیر الرجال ۴۔ شرح صحیفۂ سجادیہ اور ۵۔ ثمرۃ الفواد۔ ان تصانیف کے عنوانات ہی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شریف لاہیجی کا

موضوع سخن کیا رہا ہوگا۔ صرف ان کی ایک کتاب ''محبوب القلوب'' کے عنوان سے اس کے مطالب کے بارے میں غلط فہمی ہوسکتی ہے اس لیے یہ لکھ دینا ضروری ہے کہ اس کتاب کا موضوع ماقبل اسلام فلسفیوں کی تاریخ ہے۔ یہ کتاب خاصی ضخیم ہے۔ اس کا فارسی ترجمہ سید احمد اردکانی نے کیا ہے اور متن ترجمہ کی تصحیح و تحقیق علی اوجبی نے کی ہے۔ یہ کتاب ۱۳۸۰ھ ش (مطابق ۲۰۰۲ء) میں کتاب خانہ وموزہ ومرکز اسناد مجلس شورای اسلامی'' کی طرف سے شائع ہوئی ہے جس کا متن ۴۴۶ صفحات پر محیط ہے۔ اس میں بقراط، جالینوس، لقمان حکیم، فیثا غورس، سقراط، افلاطون، ارسطو، اقلیدس اور بطلیموس جیسے دسیوں فلسفیوں کے حالات زندگی اور افکار وخیالات سے بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شریف لاہیجی کا دماغ کس قدر فلسفیانہ واقع ہوا تھا۔[۶]

☆

حواشی ومراجع

۱۔ ان کی دو کتابوں میں قطب الدین کی جگہ بہاء الدین درج ہے جس پر محدث ارموی نے طویل بحث کی ہے۔ ہم نام کی اس بحث سے صرف نظر کرتے ہیں۔

۲۔ مقدمہ، ص ۷

۳۔ فرہنگ فارسی، اعلام، ص ۱۴۶۹، طبع ہشتم ۱۳۷۱ھ ش

۴۔ حوالہ سابق، ج ۵، ص ۱۰۱۹

۵۔ فرہنگ فارسی، محمد معین، ج ۵، ص ۷۹۲

۶۔ محبوب القلوب کے بارے میں یہ معلومات 'دانش' کراچی، شمارہ: ۸-۷۹، ص ۲۴۷ سے ماخوذ ہیں۔

تعارف وتبصرہ

مکی اسوۂ نبوی۔ مسلم اقلیتوں کے مسائل کا حل پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی

ناشر: اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی-۲، ۲۰۰۵ء، صفحات: ۳۲۷، قیمت -/۲۰۰ روپے

عصر حاضر میں دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمان اقلیت کی حیثیت سے زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ طرح طرح کے مسائل سے دوچار ہیں، مثلاً کثیر قومی معاشرہ میں دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ ان کا رہن سہن، معاملات اور باہمی تعلقات کیسے ہوں؟ اقلیت میں رہتے ہوئے وہ اپنے دینی شعائر اور واجبات پر کیسے عمل پیرا ہوں؟ وغیرہ۔ قرآن وسنت کی روشنی میں ان سوالات کے جوابات دینا اور رسول کریم ﷺ اور صدر اول کے مسلمانوں کا اسوہ پیش کرنا معاصر مسلم مفکرین کی ذمہ داری ہے۔

زیر نظر کتاب اسی موضوع پر ایک تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ ہے۔ فاضل مصنف پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی سیرت کے موضوع پر اتھارٹی سمجھے جاتے ہیں۔ سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤں پر ان کی متعدد کتابیں ہیں۔ اور بہت سے تحقیقی مقالات، مجلّہ تحقیقاتِ اسلامی اور دیگر رسائل کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ موضوعاتِ سیرت پر ان کی تحریریں عصری تناظر میں تحقیقی رنگ لیے ہوئے ہوتی ہیں۔ زیر نظر کتاب میں انھوں نے مکی عہد نبوی کا اس حیثیت سے مطالعہ پیش کیا ہے کہ اس کا اسوہ اختیار کر کے معاصر دنیا کی مسلم اقلیتوں کے مسائل کو بخوبی حل کیا جاسکتا ہے۔

اصلاً یہ کتاب ان خطبات پر مشتمل ہے جو مرحوم مولانا محمد رضوان القاسمی ناظم دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد کی دعوت پر ۱۶ تا ۲۰ رجولائی ۲۰۰۳ء حیدرآباد کے اہلِ علم اور اصحابِ ذوق کے ایک بڑے مجمع کے سامنے دیے گئے تھے۔

یہ کتاب آٹھ خطبات پر مشتمل ہے۔ پہلے خطبہ کا عنوان ہے ''مکہ مکرمہ کا کثیر قومی معاشرہ'' اس میں مکہ میں رہنے والے مختلف قبائل اور مختلف پیروان مذاہب کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ دوسرے خطبے ''مکی مسلم اقلیت کا ارتقاء'' میں یہ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح مکہ میں

مسلمانوں کی اجتماعیت تشکیل پائی اور کس طرح اس نے ارتقاء کے مراحل طے کیے۔ اس سلسلے میں مکہ میں مسلمانوں کے ذریعے دعوت وتبلیغ، دین پر عمل آوری، مساجد کی تعمیر اور تعلیم وتربیت کے مراکز کے قیام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تیسرا خطبہ ہجرت حبشہ اور وہاں مسلمانوں کے قیام، دینی وسماجی حالات اور وہاں کی مقامی آبادی کے ساتھ معاملات کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ چوتھا خطبہ مکہ میں مسلمانوں کی دینی، سماجی، اقتصادی، تجارتی اور صنعتی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ اگلے دو خطبوں میں نظامِ مدافعت وحقِ تحفظ اور دفاعی معاہدوں کا بیان ہے۔ ساتویں خطبہ میں مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے بعد مکہ اور دیگر علاقوں میں اقلیت میں رہنے والے مسلمانوں کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آٹھویں خطبہ کا عنوان ہے ''معاصر مسلم اقلیتوں کے لیے لائحۂ عمل'' اس میں گزشتہ مباحث کا خلاصہ کرتے ہوئے سیرت نبوی کی روشنی میں معاصر مسلم اقلیتوں کے لیے رہ نما نکات پیش کیے گئے ہیں۔

یہ کتاب موجودہ دور کے ایک اہم موضوع سے بحث کرتی ہے۔ امید ہے کہ علمی و دینی حلقوں میں اسے پذیرائی حاصل ہوگی اور اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا جائے گا۔

(محمد رضی الاسلام ندوی)

تازیانے

مولانا ابوالبیان حماد عمری

ناشر: پرنٹیک پبلشنگ ہاؤس، بنگلور، سنہ اشاعت: ۲۰۰۴ء، صفحات: ۲۰۰، قیمت -/۶۰ روپے

زیرنظر کتاب امام ابن حجر عسقلانیؒ (یا امام ابن حجر ہیتمیؒ) کی کتاب المنبّہات کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کی اولین اشاعت ۱۹۵۰ء میں ہوئی تھی۔ اب نصف صدی بعد اس کی اشاعتِ دوم منظر عام پر آئی ہے۔ بقول مترجم ''یہ دعوتی انداز کی کتاب ہے، جس میں فطرتِ انسانی کو ایسے امور کی انجام دہی پر ابھارا گیا ہے جو مرغوب ومطلوب ہیں اور ان باتوں سے روکا گیا ہے جو نامرغوب اور نامطلوب ہیں۔ اس میں دین کے رموز ونکات اور شریعت کے اسرار وحکم بیان کیے گئے ہیں۔ اس سے نہ صرف خاکستر دل میں یقین وایمان کی دبی ہوئی چنگاریوں کو بھڑکانے میں مدد لی جاسکتی ہے، بلکہ تقویٰ وطہارت کے پوشیدہ

جذبات ابھارے جاسکتے اور دعوت وتبلیغ کے سلسلے میں بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے'' (ص ۷)

یہ کتاب نو ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب نصائح کی تعداد کے اعتبار سے معنون ہے، یعنی اگر اس میں نصیحت کے دو بول ہیں تو اس کا عنوان باب الثنائی اور تین ہیں تو باب الثلاثی رکھا گیا ہے۔ آخری باب العشاری ہے جس میں نصیحت کی دس باتیں مذکور ہیں۔ ہر باب میں آں حضرت ﷺ کی احادیث مبارکہ، آثار صحابہ اور بزرگانِ دین اور حکماء عالم کے اقوال میں سے نصائح اور مواعظ کا انتخاب درج ہے۔ (ص ۱۸)

اس کتاب میں متعدد ایسی روایتیں بھی ہیں جو محض واعظانہ ہیں اور صحت کے معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ پہلا ایڈیشن بغیر تخریج روایات کے شائع ہوا تھا۔ دوسری اشاعت کے موقع پر فاضل مترجم نے تخریج کا کام اپنے دو شاگردوں کے حوالے کیا۔ اور جو کچھ وہ کر سکے اسے شامل کتاب کر دیا گیا ہے۔

فاضل مترجم اعلیٰ ادبی ذوق رکھتے ہیں، انھوں نے کتاب کا لفظی ترجمہ کرنے کے بجائے شستہ، شگفتہ اور سلیس زبان میں ترجمانی کی ہے۔ عربی اشعار کا ترجمہ اردو اشعار میں کر دیا ہے۔ امید ہے کہ اس کتاب کو دینی حلقوں میں قبولیت حاصل ہوگی۔

(م-ر-ن)

اردو رسائل کے قرآنی مضامین کا اشاریہ ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی

ناشر: ادارۂ علوم القرآن، پوسٹ بکس نمبر ۹۹، سرسید نگر، علی گڑھ، ۲۰۰۵ء، صفحات: ۳۲۳، قیمت -/۱۵۰ روپے

آج کی علمی دنیا میں اشاریہ سازی کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ اس کی وجہ سے محققین کتابوں اور رسائل کی غیر ضروری ورق گردانی سے بچ جاتے ہیں اور مطلوبہ معلومات تک بسہولت ان کی رسائی ہو جاتی ہے۔ اس اہمیت کی بنا پر بہت سے علمی، ادبی اور دینی مجلات کے اشاریے تیار کیے گئے ہیں اور شخصیات اور موضوعات کی بھی اشاریہ سازی کی گئی ہے۔ زیر نظر کتاب میں قرآنیات پر چند اہم اردو رسائل میں شائع ہونے والے مضامین کا اشاریہ مرتب کیا گیا ہے۔

یہ اشاریہ اولاً مجلّہ علوم القرآن علی گڑھ میں کئی قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں اس کی افادیت کے پیش نظر ادارہ کی جانب سے کتابی صورت میں اس کی اشاعت عمل میں آئی ہے۔ اس میں ہندو پاک کے ۳۴ راہم علمی و دینی مجلّات میں شائع ہونے والے ۲۸ سو سے زائد مضامین کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اور ۲۱ ذیلی موضوعات میں انھیں مرتب کیا گیا ہے۔

دینی موضوعات اور خاص طور پر قرآنیات میں اشاریہ سازی کے سلسلے میں اب تک کوئی قابل ذکر کام نہیں ہوا ہے۔ اس اعتبار سے مصنف اور ناشر علمی حلقوں کی جانب سے شکریے کے مستحق ہیں کہ اس کتاب کے ذریعے قاری کو مختلف قرآنی موضوعات پر کئی ہزار مضامین کا علم ہو جاتا ہے۔ لیکن افسوس کہ اشاریہ سازی میں جو دقت و احتیاط اور حسن ترتیب ہونی چاہیے وہ اس کتاب میں مفقود ہے۔ کسی بھی اشاریہ سے دو فائدے لازماً حاصل ہونے چاہئیں، ایک یہ کہ قاری کو مطلوبہ معلومات بسہولت حاصل ہو سکیں، دوسرے مکمل معلومات حاصل ہوں، تاکہ وہ متعلقہ رسائل میں اپنی مطلوبہ چیزوں کو تلاش کر سکے۔ اس کتاب کے یہ دونوں پہلو کم زور ہیں۔ اگر کوئی قاری یہ جاننا چاہے کہ مذکورہ رسائل میں نظم قرآن، اقسام القرآن، فکر فراہی، مسئلہ رجم، حروف مقطعات وغیرہ پر کتنے مضامین شائع ہوئے ہیں تو اسے یہ معلومات کہیں یکجا نہیں مل سکتیں، بلکہ پورے اشاریے کی ورق گردانی کرنی پڑے گی۔ اور صحیح اور مکمل معلومات کا یہ حال ہے کہ پروف ریڈنگ کی لاپروائی کی وجہ سے کہیں مضامین کے عناوین غلط چھپ گئے ہیں، کہیں مضمون نگار کا نام چھوٹ گیا ہے، کہیں مہینہ تو کہیں سنہ اشاعت غائب ہے۔ ایک ہی مضمون اگر ایک سے زائد رسالوں میں شائع ہوا ہے تو اسے الگ الگ ذکر کیا گیا ہے۔ قسط وار مضامین کی تمام قسطوں کا احاطہ نہیں کیا گیا ہے۔ یا ایک ہی مضمون کی بعض قسطوں کا تذکرہ کہیں ہے، بعض قسطوں کا تذکرہ کہیں اور۔ ایک ہی مضمون ایک جگہ ایک مضمون نگار کے نام سے ہے، وہی مضمون دوسری جگہ دوسرے مضمون نگار کے نام کے ساتھ درج ہے۔ ''تعارف کتب'' کے کالم میں عموماً تبصرہ نگار کا نام دیا گیا ہے، لیکن کہیں کہیں تبصرہ نگار کی جگہ 'مؤلف' کا نام درج ہے۔ بعض تبصروں کو 'مضامین' سمجھ کر انھیں دوسرے موضوعات کے ضمن میں جگہ دی گئی ہے۔ اپنے ابتدائیہ میں فاضل

مرتب نے ان رسائل کا تعارف کرایا ہے جن کے مضامین اس اشاریے میں شامل کیے گئے ہیں۔ ان میں سہ اشاعتی آیات، علی گڑھ کا ذکر نہیں ہے، مگر اس کے مضامین بھی اشاریہ میں شامل ہیں۔ معلوم نہیں کیوں ماہ نامہ 'حکمت قرآن' لاہور کے مضامین اس اشاریہ میں جگہ نہیں پا سکے ہیں۔

(م-ر-ن)

حركة الترجمة في العصر العباسي — اورنگ زیب الاعظمی

ناشر: دارالحرف العربی بیروت، ۲۰۰۵ء، صفحات: ۱۵۹، قیمت درج نہیں۔

عہدِ عباسی مسلمانوں کے علمی وفکری ارتقاء کا زریں دور ہے۔ اس دور میں مختلف علوم وفنون کی کتابیں یونانی، سریانی، سنسکرت، فارسی اور دیگر زبانوں سے عربی میں منتقل ہوئیں۔ اس موضوع پر اعلیٰ معیار کی تاریخی وتحقیقی کتابیں مختلف زبانوں میں موجود ہیں۔ زیرنظر عربی کتاب میں اس عہد میں ترجمہ کے میدان میں ہونے والی سرگرمیوں کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے۔

مصنف نے ابتدا میں عہدِ جاہلی، ابتدائے اسلام اور عہد اموی میں تحریکِ ترجمہ کا سرسری تذکرہ کرتے ہوئے عہدِ عباسی میں ترجمہ کے مختلف مراحل اور محرکات پر روشنی ڈالی ہے۔ پھر ترجمہ کے مراکز اور اداروں کا تعارف کرایا ہے۔ عباسی خلفاء اور وزراء کی علمی سرپرستی کو بیان کیا ہے۔ مختلف زبانوں کے مترجمین کی فہرست پیش کی ہے۔ ترجمہ کی اقسام بیان کی ہیں۔ عہدِ عباسی میں کیے جانے والے تراجم پر بعض اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ مشہور مترجمین کی مختصر سوانح بیان کی ہے اور آخر میں عہدِ عباسی کے چند مشہور کتب خانوں اور ذخیروں کا تذکرہ کیا ہے۔

فاضل مصنف کی پیش کردہ ''منتخب فہرست کتابیات'' ڈیڑھ سو کتابوں پر مشتمل ہے، لیکن بہت سی کتابیں غیر متعلق ہیں۔ ثانوی مراجع کا استعمال بہت فراخ دلی سے کیا گیا ہے۔ عہدِ عباسی کے بعض مترجمین کو ان کا مناسب مقام نہیں مل سکا ہے۔ اسحاق بن حنین

کا کہیں کہیں نام تو آیا ہے، لیکن ''اعلام المترجمین'' میں وہ جگہ نہیں پاسکا ہے۔ بنوموسیٰ بن شاکر کا بس ایک جگہ نام آسکا ہے۔ حبیش کو ایک جگہ (ص ۱۰۰) اسحاق بن حنین کا بھانجا لکھا گیا ہے، جب کہ وہ اس کا پھوپھی زاد بھائی تھا۔

(م-ر-ن)

اعلانِ ملکیت سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی، فارم:۴، رول:۹

۱۔ مقام اشاعت: پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ
۲۔ نوعیت اشاعت: سہ ماہی
۳۔ پرنٹر پبلشر: سید جلال الدین عمری
۴۔ قومیت: ہندوستانی
پتہ: دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵
۵۔ ایڈیٹر: سید جلال الدین عمری،
پتہ: دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵
۶۔ ملکیت: ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی،
پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ

بنیادی ارکان کے اسمائے گرامی

۱۔ مولانا سید جلال الدین عمری (صدر)
دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵
۲۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی (سکریٹری)
فریدی ہاؤس، سرسید نگر، علی گڑھ (یوپی)
۳۔ ڈاکٹر محمد رفعت (خازن)
شعبۂ فزکس، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
۴۔ ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری (رکن)
دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵
۵۔ مولانا محمد فاروق خاں (رکن)
۱۳۵۳-بازار چتلی قبر، دہلی-۶
۶۔ مولانا مطیع اللہ کوثر یزدانی (رکن)
دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی، ۲۵
۷۔ جناب ٹی، کے، عبداللہ (رکن)
مالاتھن کنڈی ہاؤس، پیلیری، کالی کٹ
۸۔ ڈاکٹر احمد سجاد (رکن)
طارق منزل، بریا توہاؤسنگ کالونی، رانچی
۹۔ جناب محمد جعفر (رکن)
دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵
۱۰۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ (رکن)
مزمل منزل کمپلکس، علی گڑھ (یوپی)
۱۱۔ انجینیر سید سعادت اللہ حسینی (رکن)
نان دیڑ

مندرجہ بالا معلومات میرے علم ویقین کی حد تک بالکل درست ہیں۔

پبلشر
سید جلال الدین عمری

خبر نامہ ادارۂ تحقیق و تصنیفِ اسلامی

☆ اللہ کا شکر ہے کہ صدر ادارہ مولانا سید جلال الدین عمری کی تصنیفات کو علمی و دینی حلقوں میں خوب قبولِ عام حاصل ہو رہا ہے۔ ''خدا کی غلامی- انسان کی معراج'' کے نام سے ایک کتابچہ کئی سال قبل مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی سے شائع ہوا تھا۔ حال میں اس کی اشاعتِ دوم نظر ثانی کے بعد پہلے سے بہتر شکل میں ہوئی ہے۔ (صفحات ۳۶، قیمت ۱۰ روپے) اس کا ہندی، تلگو اور مراٹھی زبانوں میں ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ مولانا کی ایک دوسری کتاب ''یہ ملک کدھر جا رہا ہے؟'' کے عنوان سے ہے۔ نظر ثانی اور خاطر خواہ اضافہ کے بعد اس کا تیسرا ایڈیشن منظر عام پر آیا ہے (صفحات: ۶۴، قیمت ۲۰ روپے)۔ ہندی میں اس کا ترجمہ ''ہمارا دیش کدھر جا رہا ہے؟'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس کے تین ایڈیشن سامنے آ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا کی کتاب ''جماعت اسلامی ہند- پسِ منظر، خدمات اور طریقۂ کار'' کا مراٹھی ترجمہ ابھی حال میں منظر عام پر آیا ہے۔ اسے اسلامک مراٹھی پبلی کیشنز ٹرسٹ ممبئی نے شائع کیا ہے (صفحات ۴۸، قیمت ۱۲ روپے)

☆ جماعت اسلامی ہند نے ماہ ربیع الاول کو ''ماہ سیرت'' کی حیثیت سے منانے کا فیصلہ کیا اور اس کے تحت پورے ملک میں ''سیرت نبوی'' کے خصوصی پروگرام منعقد کیے گئے۔ اس موقع سے مولانا عمری نے ''آخری رسول حضرت محمد ﷺ: سیرت اور پیغام'' کے نام سے عام فہم اسلوب میں ایک موثر کتابچہ (صفحات ۱۶) مرتب کیا ہے۔ اسے جماعت اسلامی ہند کے شعبۂ دعوت کی جانب سے اردو اور ہندی میں بڑے پیمانے پر تقسیم کیا گیا ہے۔

☆ رکنِ ادارہ مولانا محمد جرجیس کریمی کی نئی کتاب ''مسلمانوں کی حقیقی تصویر

(غلط فہمیوں کا ازالہ)'' مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز نئی دہلی سے شائع ہوگئی ہے۔ (صفحات ۱۶۴، قیمت ۵۵ روپے) اس کتاب میں بعض ان غلط فہمیوں کا ازالہ کیا گیا ہے جو مسلمانوں کے بارے میں پائی جاتی ہیں اور جن کی وجہ سے مسلمانوں کے ساتھ اسلام کو بھی نشانہ بنایا جاتا ہے۔

☆ مولانا صدر الدین اصلاحی (۱۹۱۷- ۱۹۹۸ء) کا بیسویں صدی میں ہندوستان کے عظیم علماء و مفکرین میں شمار ہوتا ہے۔ وہ تحریک اسلامی ہند کے صف اول کے قائدین میں سے تھے اور ادارۂ تحقیق کے بانی صدر تھے۔ ان کی علمی خدمات کے تعارف و تجزیہ کے لیے انجمن طلبۂ قدیم مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ کے زیر اہتمام ایک سہ روزہ سمینار ۲۷-۲۹/اپریل ۲۰۰۶ء میں مدرسہ کے کیمپس میں منعقد ہوا۔ کارکنانِ ادارہ نے اس میں شرکت کی۔ مولانا جلال الدین عمری نے سمینار کے ایک اجلاس کی صدارت کی۔ اپنے صدارتی کلمات میں انھوں نے مولانا صدر الدین اصلاحی کی علمی اور تحریکی خدمات اور ان کی تصانیف کی اہمیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ مولانا مدظلہ مولانا مرحوم کے شاگردِ رشید رہے ہیں۔ ایک دوسرے اجلاس میں انھوں نے طویل رفاقت کی خوش گوار یادیں پیش کیں۔ سمینار کے لیے مولانا نے ان کی تفسیر ''تیسیر القرآن'' کے تعارف و تجزیہ پر مشتمل مضمون تیار کیا تھا۔ مولانا سلطان احمد اصلاحی نے ''تحریک اسلامی ہند کے لٹریچر میں مولانا صدر الدین اصلاحی کی تصنیفات کی اہمیت'' اور ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے ''تلخیص تفہیم القرآن'' پر مقالات پیش کیے۔

☆ سال رواں کے اختتام کے ساتھ ''مجلہ تحقیقات اسلامی'' کی اشاعت کو انشاء اللہ پچیس سال پورے ہوجائیں گے۔ اس مناسبت سے اس سال کے آخری شمارے کو ''خصوصی شمارہ'' کی حیثیت سے شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس میں ان شاء اللہ مدیر مجلہ کے قلم سے ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی کی پچیس سالہ خدمات کا تعارف پیش کیا جائے گا، مجلہ تحقیقات اسلامی کا پچیس سالہ موضوعاتی اشاریہ شائع کیا جائے گا اور بعض دیگر خصوصی مضامین بھی ہوں گے۔

(ادارہ)